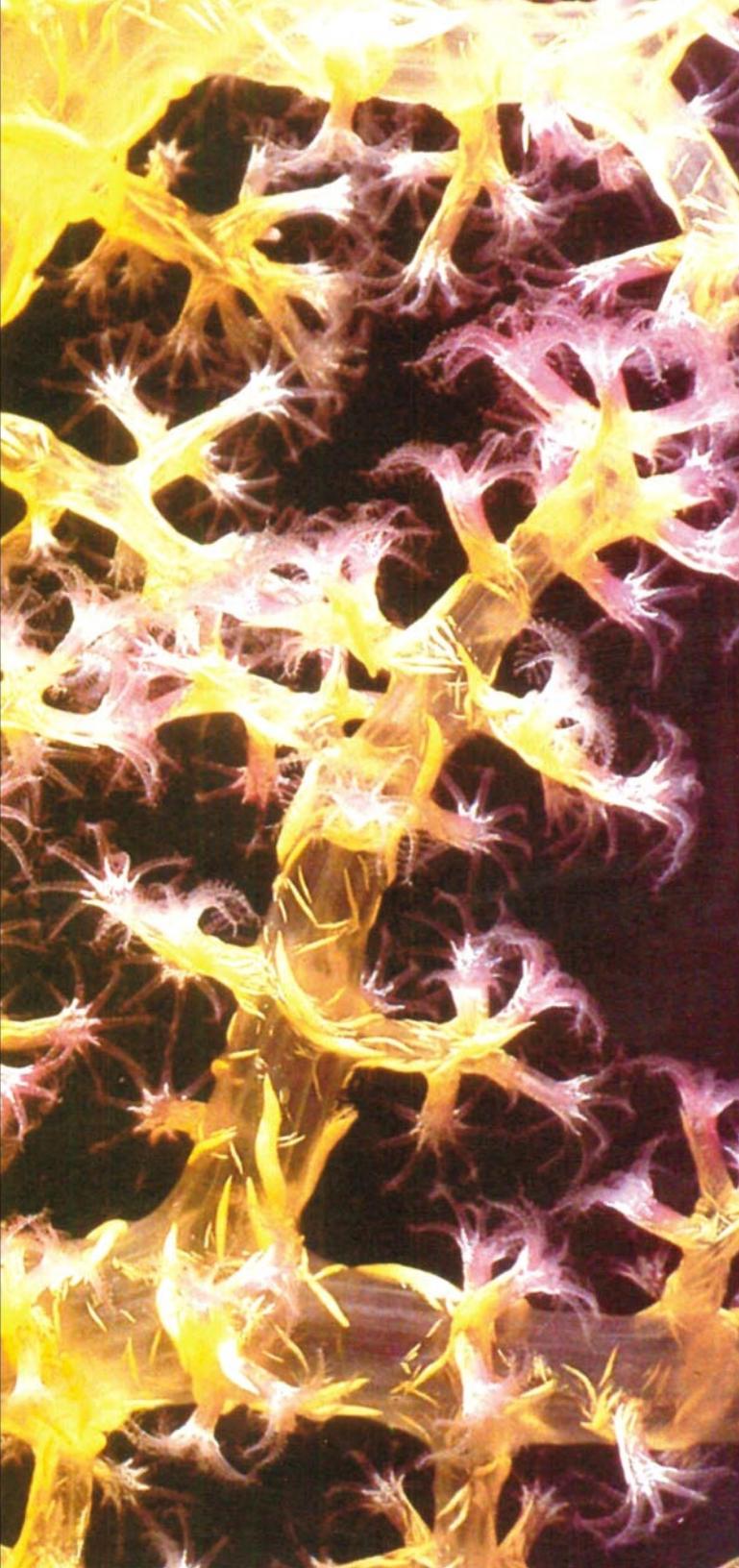


انسانی حقوق کا ارتقاء

مؤلفہ
پٹر جیکب



Evolution of Human Rights

انسانی حقوق کا ارتقا

مؤلف

پٹیر جیکب

معاون

سنیل ملک

انسانی حقوق کا ارتقا : عنوان
 پیغمبر جیکب : مؤلف
 اکتوبر 2017ء : اشاعت
 1000 : تعداد
 300 روپے : قیمت
 پیغمبر جیکب : سرورق
 سانچہ پبلیکیشنز - لاہور : تقسیم کار

دوسرا منزل، مفتی بندگ 17/31 ٹھیک روڈ، لاہور

فون: 042-7355323

ای میل: sanjhpk@yahoo.com

ناشر:



ادارہ برائے سماجی انصاف

فون:	042-36661322
ای میل:	info@csjpak.org
ویب سائٹ:	www.csjpak.org
فیس ٹک:	Centre For Social Justice
ٹوئیٹر:	@csjpak

ISBN: 978-969-7681-05-1

انتساب:

انسانی حقوق کے کارکنوں کے نام
جن کے دم سے
بہار کے امکان زندہ ہیں۔

فہرست مضمایں

صفحہ نمبر	مضایں	باب
9	پیش لفظ	
13	انسانی حقوق کی تاریخ	1
25	انسانی حقوق کی جدوجہد اور اہم سنگ میل	2
35	انسانی حقوق کی چند نمایاں تحریکیں	3
49	جدید تصور اور بین الاقوامی ادارے	4
62	اقوام متحده کے نظام میں اصلاحات	5
69	بین الاقوامی عدالت انصاف سے بین الاقوامی فوجداری عدالت تک	6
73	پاکستان میں انسانی ترقی کا بھرمان	7
80	نظم کوتول	8
82	پاکستان میں انسانی حقوق کی تحریکیں	9
95	کلیسا اور انسانی حقوق	10
99	انسانی حقوق کا آفاقی اسلامی منشور	11
109	اسلام اور انسانی حقوق	12
122	اہم سوالات و جوابات	13
135	انسانی حقوق کا عالمگیر اعلامیہ	14

خالی

پیش لفظ

یہ خواب تو شاید ہر شہری نے دیکھا ہوگا کہ پاکستان ایک ایسا معاشرہ بنے جس کی پہچان انسانی حقوق کا احترام ہو۔ لیکن اس امکان کو حقیقت کا روپ دینے میں بڑی رکاوٹ انسانی حقوق کے فریم ورک کی مخالفت ہے جو اکثر اس سے عدم واقفیت کی بنا پر ہوتی ہے۔ باوجود کہ مخالفت کرنے والوں نے کوئی قبلِ عمل متبادل بھی کم ہی دیا اور اگر دیا تو ایسا جو آزمودہ مُگرنا کام ثابت ہو چکا ہے۔

انسانی حقوق کی تعلیم و ترویج کا کام کیسے ہو جب ایک طرف انسانی حقوق کو پیر و نی مداخلت بتایا جائے اور دوسری طرف ملکی نظام انصاف و ریاست کو ایسی حالت میں رکھا جائے جو عوام کی توقعات پر پورا نہیں اُترتا۔ عام لوگ خصوصاً نسل اس نظام سے ماہیں نظر آتی ہے۔ لوگ امید کے کسی فلسفہ کو ایسے دیکھتے ہیں جیسے کوئی مفلس بچہ دکان میں بجے کھلونے کی طرف دیکھتا ہے جو بظاہر اس کی پہنچ سے باہر ہوتا ہے۔ انسانی حقوق کی بات بھی شک اور بھی نا امیدی سے سنی جاتی ہے۔ چنانچہ انسانی حقوق سے متعلق ان کی تفہیم کا غنچہ کیسے کھلے؟

دوسرے مسئلہ زبان و بیان کا ہے۔ اردو و دیگر مقامی زبانوں پر عدم توجہ ابلاغ کی راہ میں رکاوٹ ہے۔ اس پر طرہ ہمارا نظام تعلیم اور نصاب۔ معیار تعلیم کچھ ایسے گرا کہ علم نام کی چیز جنس گراں ہو گئی۔ تو پھر عام لوگوں کو درست معلومات اور نئے زاویہ نظر کیسے پہنچ لیں؟ گزشتہ چند دہائیوں میں تاریخ کچھ ایسے پڑھائی گئی جس نے ایسے ذہن پیدا کئے جو دنیا اور اس کے حالات کو انتہائی محدود زاویے اور جانبداری کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ ادھر انسانی حقوق کا علم اور اطلاعی نظام اتنا وسیع ہو چکا ہے کہ اہم پہلو وؤں اور موضوعات کو ایک کتاب میں جمع کرنا مشکل ہے۔

اس کتاب کی تیاری میں مندرجہ بالا امور کو مد نظر رکھا گیا ہے۔ موضوعات باوجود کہ ثقیل اور گہرے ہیں انسانی حقوق کے ارتقا پر یہ کتاب پہلی جماعت کے قاعدے کی طرز پر لکھی گئی ہے۔ کئی سال پہلے بگلہ دیش سے چھپنے والی فادرڈ کٹ ٹم کی کتاب ہسٹری آف ہیومن ریٹس سے تحریک ملی۔ اس کتاب کے چارابواب تراجم کے ساتھ شامل کئے گئے۔ رحمان فیض کاضمون ایسا عمدہ ہے کہ اسے اب چوتھے ایڈیشن میں بھی شامل کیا جا رہا ہے۔ انسانی ترقی کے موضوع پروجہ مسعود کے مضمون سے اس اہم پہلو پر تازہ معلومات کا اضافہ ہو گیا ہے۔ گزشتہ ایڈیشنز میں اس وقت کے معاونین ساتھیوں کا شکریہ ادا ہو چکا، کتاب کے چوتھے ایڈیشن کی اشاعت میرے لیے انہائی خوشی اور اطمینان کا باعث ہے۔ جو تراجم اور اضافے کے ساتھ پیش کیا جا رہا ہے۔

زیر نظر ایڈیشن کی اشاعت میں ساتھی سُنیل ملک نے توجہ اور لگن سے کام کیا جو ان کا خاصہ ہے۔ نیدر لینڈز سے ہماری پاٹر تنظیم ICCO نے اشاعت کے اخراجات برداشت کئے جس کے لئے ادارہ برائے سماجی انصاف اور احقر مشکلور ہیں۔

جہاں پر کوئی کمزوری پائی جائے اس کے لیے خاکسار کو ذمہ دار سمجھا جائے۔ اپنی رائے چھیجن تاکہ غلطیوں کا اعادہ نہ ہو۔ امید ہے کہ یہ کاؤنٹ پاکستان میں انسانی حقوق کی تعلیم و تربیت اور انسانیت کا احترام بڑھانے میں معاون ثابت ہو گی۔

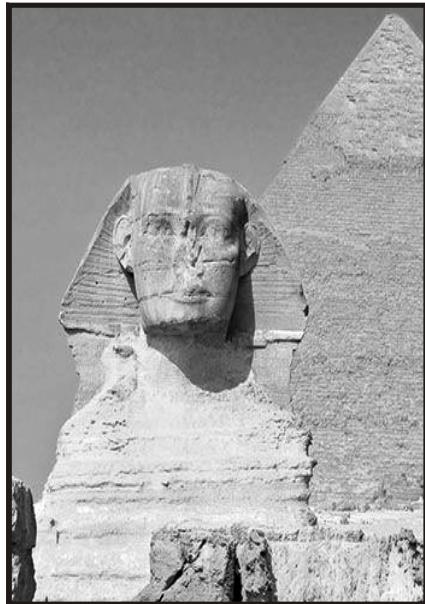
یار زندہ صحبت باقی۔

پیغمبر جیکب



شمالی افریقہ (الجزائر) کے ایک غار میں
یہ ہزاروں سال پرانی تصویریں انسان کی
سماجی بقاء اور منظم زندگی کے خواب کی
آئینہ دار ہیں۔

اصول قانون کی ترقی میں بابل اور یونان
کی تہذیبوں میں گراں قدر کام ہوا تو
مصر کی قدیم تہذیب فنون کے اعتبار سے
نقش بے مثال تھی۔



تو کارِ زمین را نکو ساختی
کہ با آسمان نیز پرداختی

(سعدی)

(ترجمہ: کیا تو نے زمین کا کام سنوار لیا ہے جو آسمان کی طرف پرواز کر رہا ہے؟)
اگر نہ سہل ہوں مجھ پر زمیں کے ہنگامے
بُری ہے مستی اندیشہ ہائے افلائی

(اقبال)

سادھو بھائی، جیوت ہی کرو آسا
جیوت سمجھے، جیوت بوجھے، جیوت ملتی نواسا
جیوت کرم کی پھانس نہ کاٹی، موئے ملتی کی آسا
تن چھوٹے جیو ملن کہتے ہے، سو سب جھوٹی آسا
اب ہوں ملا تو تب ہوں ملا، نہیں تو جم پُر باسا
ست گھے ست گرو کو بھی نہیں، ہم سادھن کے داسا

(بھگت کیمیر)

میرے بھائی، جب تک زندہ ہوت تک امید رکھو۔ سمجھ بوجھ زندگی ہی میں ممکن
ہے۔ نجات بھی زندگی ہی میں ممکن ہے۔ اگر تم نے زندگی میں اپنے بندھن نہیں توڑے (کرم
کا پھنڈہ نہیں کاٹا) تو مرنے کے بعد نجات کی کیا امید رکھتے ہو۔ یا ایک خیالِ خام ہے کہ روح
تن سے نکل کر بھگوان سے مل جائے گی۔ اگر وہ اب ملا تو تب بھی ملے گا، نہیں تو موت کی نگری
میں بستا پڑے گا۔ ست (صداقت) کو آج گرفت میں لاو، ست گرو کو آج پہچانو، ست نام پر
آج یقین کرو۔ کبیر کہتے ہیں کہ ہم تو ملاش اور جستجو کے جذبے کے غلام ہیں، کیونکہ آخر میں
یہی جذبہ کام آتا ہے۔

ترجمہ: سردار جعفری



انسانی حقوق کی تاریخ

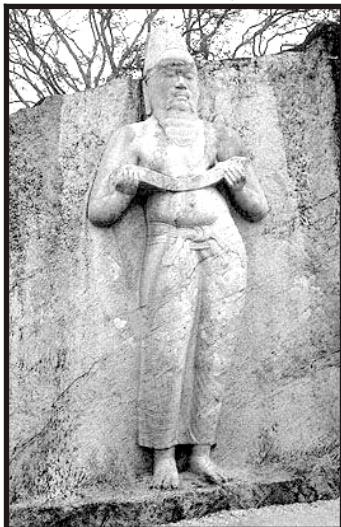
قانون اور حقوق

آنکھ کے بد لے آنکھ اور دانت کے بد لے دانت، اس اصول کا بابل میں چار مرتبہ ذکر آیا ہے اور حضرت موسیٰ کی شریعت کے حوالہ سے دنیا میں زیادہ معروف ہو گیا۔ لیکن اس اصول کو پہلی مرتبہ بابل (موجودہ عراق) کے حکمران حمورابی (1792 سے 1750 ق.م) کے ضابط قانون میں شامل کیا گیا۔ حمورابی کا قانون پہلے سے موجود سو میریا کے قانون کی نیاد پر بنایا گیا اور اُس وقت کے قبلی رسم و رواج سے ہٹ کر تھا۔ یہ 282 عدالتی فیصلوں پر بنی قوانین کو سامنے رکھ کر تدوین کیا گیا تھا جس میں کچھ قوانین خونی تنازعات، ذاتی طور پر انتقام لینے اور اغوا کے ذریعے شادی پر پابندی سے متعلق تھے۔

آنکھ کے بد لے آنکھ کے قانون کو ”قدیم اصول بتا“ بھی کہا جاتا ہے۔ قدیم بابل، یونان اور رومی سلطنت میں بد لے کا یہ قانون ایک سزا کے طور پر متعارف ہوا۔ جس حد تک اور جس طریقے سے کسی شخص کو نقصان پہنچایا گیا ہو بالکل اُسی طرح سے مجرم کو سزا دی جاسکتی تھی۔ یہ انصاف کی سخت گیر شکل تھی لیکن قدیم فلسطین اور رومی قانون میں سزا کی بجائے ہرجانے یعنی رقم (دیت) کی ادائیگی کی گنجائش موجود تھی۔ پانچویں صدی قبل مسیح میں اس قانون کو منسوب بھی کیا گیا اور رومی عدالتوں میں جسمانی سزا کی گلہ جرمانے کی سزا کا آغاز ہو چکا تھا۔ تاہم بد لے کے قانون، کے زیر اثر بعذاز اس بھی سخت جسمانی سزاوں کا اطلاق ہوتا رہا۔

‘آنکھ کے بد لے آنکھ کا قانون عملی اعتبار سے دراصل حرم کا قانون تھا جس میں جرم کی سزا مقرر کر دی گئی۔ اس سے پہلے اگر ایک قبیلے کا فرد دوسرے قبیلے کے کسی فرد کو نقصان پہنچتا تو پہلا قبیلہ دوسرے کے خلاف جنگ کر سکتا تھا۔ لہذا سزا جرم سے ہونے والے نقصان سے زیادہ ہوتی تھی۔ آنکھ کے بد لے آنکھ کے قانون نے سزا کو جرم سے متناسب کر دیا۔ اس سزا کا اطلاق ایک نج کے ذریعہ سے ہوتا جو نقصان کا تعین کرنے کے بعد مجرم کے خلاف جرم ان عائد کرتا تھا اور چونکہ اس قانون نے انتقام کی حد مقرر کر دی اس لیے یہ بد لے کے قانون کے ساتھ ساتھ حرم کا قانون بھی تھا۔

قدیم ہندوستان میں اشوک عظم کی طرف سے متعدد شاہی فرمان جاری ہوئے جنہیں حقوق انسانی کے ابتدائی تصورات کہا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا۔ اشوک عظم نے 232 - 268 ق۔ م تک ہندوستان اور افغانستان پر حکومت کی۔ اشوک عظم کو اس ناطے سے ایشیا میں



اشوک عظم 268 - 232 قم

بابائے انسانی حقوق، کہا جاسکتا ہے۔ کئی دانشور اشوک بادشاہ کے شاہی فرماں میں 'انسانی حقوق کا پہلا عالمگیر اعلامیہ' قرار دیتے ہیں۔ اشوک بادشاہ نے جانوروں کے حقوق کے متعلق بھی فرمان جاری کئے۔ ہندوستان کی موجودہ ریاست اڑیسہ میں برپا ہونے والی خونی جنگ کے بعد اشوک بادشاہ نے تشدد کو ترک کر کے بدهمت اختیار کر کے دھرم (اخلاقی اصول کا مجموعہ) کی تبلیغ کا راستہ چن لیا اور تمام مذاہب اور عقیدوں کے احترام اور آزادی کی پالیسی اختیار کی۔ اشوک بادشاہ نے بہت سارے فرمان چٹانوں اور ستونوں پر کندہ

کروائے بشمول شیر کی شہیہ والے سارنا تح (Sarnath) کے ستون کے جو کہ آج کل ہندوستان کا قومی نشان ہے۔ (رومپلا تھا پر 2003)

چٹانوں پر کنہ 14 فرمانوں میں سے مندرجہ ذیل بنیادی حقوق سے کمال مناسبت رکھتے ہیں۔

- 1 وزراء کا فرض ہے کہ وہ تمام مذاہب کے بیروکاروں کے دھرم کو فروغ دیں۔
- 2 جانوروں کا سر عام ذبح کرنا منوع ہوگا۔
- 5 جانوروں کے لیے شفاخانے بنائے جائیں۔
- 7 ہر مذہب کے لوگ اپنے علاقے میں آرام و سکون سے رہیں اس حق میں مداخلت نہ ہوگی۔
- 8 دھرم کا مطلب یہ ہے کہ نوکروں، ملازموں کے ساتھ حسن سلوک اور اساتذہ کا احترام۔
- 11 تمام مذاہب کے بنیادی عقائد کو فروغ دیا جائے۔
- 12 تمام جانداروں، دوستوں اور ساتھیوں کے ساتھ تجھ اور فراخ دلی کا برتاو کیا جائے اور کسی بھی جاندار کو قتل نہ کیا جائے۔



روا داری اور برداشت کے لحاظ سے دوسرا معتبر اور قبل قدر نام ہندوستان کے شہنشاہ اکبر اعظم (1556ء تا 1605ء) کا ہے۔ شہنشاہ اکبر نے کئی انسانی حقوق کو موروث اور مختلف سماجی اور مذہبی روایات کی برداشت کو فروغ دیا جس میں اپنے عقائد کے مطابق پرستش کا حق بھی شامل تھا۔ اُس نے تعصب اور عدم روا داری کی ممانعت اور اپنی بادشاہت میں غیر مسلموں پر اضافی ملکیں کا خاتمه کر دیا۔ شہنشاہ اکبر اس بات کی وکالت کرتا تھا کہ کسی بھی فرد کے مذہبی معاملات میں مداخلت نہیں ہونی چاہیے اور ہر فرد کو کوئی بھی مذہب یا عقیدہ اختیار کرنے کی آزادی ہونی چاہیئے۔ نوبل انعام یا فہرست معيشت دان پروفیسر امرتیا سین بھی اس بات کو تحریروں میں فخر سے بیان کرتے ہیں کہ جب یورپ احیائے علوم سے برسوں پیچھے تھا تو شہنشاہ اکبر اس قسم کی اعلیٰ ظرفی کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ شہنشاہ اکبر نے غلامی اور عُسْتیٰ جیسے غیر اخلاقی رواجوں کی حوصلہ لٹکنی کی۔ اس طرح اکبر نے حقوق انسانی کے احترام کو عملی طور پر لا گو کیا۔

یونانی اور رومی تہذیبیوں کا حصہ:

یونانی تہذیب میں احیائے علوم کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے انسانوں کو دنیا اور فطرت سے متعلق جادوئی اور من گھڑت خیالات سے کافی حد تک آزاد کیا۔ فطرت (موجودات) انسان پر حاوی نہیں بلکہ خود مختاری کی انسانی خواہش کے تحت انسانوں نے فطرت پر کنٹرول کی کوشش کی۔ اس خیال کو دنیا سے متعلق ایک سائنسی تصور کا آغاز سمجھا جاسکتا ہے اور یونانی ادب ہمیں اس قسم کے رجحان دکھاتا ہے۔ نویں صدی ق.م۔ میں ہومر (Homer) کا یہ خیال تھا کہ ان دیکھی قوتیں دنیا کو چلاتی ہیں۔ ڈرامہ نویس ایس کے لیکس (525 تا 456 ق.م) نے سب سے پہلے فرد کی طاقت اور خود مختاری کو موضوع بنایا جو حتیٰ تقدیر سے بالکل الگ تصور تھا۔ ماقبل الفطرت طاقت کے سامنے شخصی آزادی کے تصور نے قانون قدرت کے نظریہ کو حتم دیا۔ یونانی ڈرامہ نویس سوفوکلیس (442 ق.م) نے قانون قدرت کی اصطلاح استعمال کرتا ہے۔

جب ایئٹی گون (یونانی داستان کا نسوانی کردار) نے بادشاہ کر یون سے یہ کہہ کر کہ ”خداوں کے غیر لافانی قوانین کے سامنے تمہاری ساری طاقت یقچ ہے۔ بادشاہ کا حکم مانتے



قدیم یونان کی ایک درسگاہ۔ بحث و تحقیق کی روایت

سے انکار کر دیا جس میں کہ اینٹی گون کو اپنے مقتول بھائی کی لعش کو گدھ اور کتوں کے سامنے ڈال دینے کو کہا گیا تھا۔ کیونکہ یہ دیوتا کے قانون سے متصادم تھا۔ اپنے بھائی کی لعش کو دفن کرنا اُس کا آفاقی فرض، قانون قدرت اور انسانیت کا حصہ تھا۔ اینٹی گون کا یہ اقدام 'سول نافرمانی' کی عظیم مثال ہے۔ سقراط، افلاطون اور ارسطو کا دعویٰ تھا کہ معروف رواجوں کو پرکھنے کے لیے لازوال معيارات موجود ہیں۔

ارسطو کے مطابق قانون قدرت (امر معروف) کی بنیاد انسانی فطرت ہی میں ہے۔ یہ حق اور انصاف کا نظام ہے جو کہ فطرتاً انسانوں میں مشترک ہے اور اچھے چال چلن کے اصولوں، منطق اور انسانی معاشرت کے فرائض پر مبنی ہے۔ تاہم قانون قدرت کے نظریہ کا دار و مدار پہلے سے موجود انسانی فطرت کی سوجھ بوجھ پر تھا۔ ارسطو کا قانون قدرت کا نظریہ ایک آئینی مدل انسانی فطرت کے تصور پر مبنی ہے جو کہ اس نظریے کا کمزور پہلو ہے اور انسانی تحقیق پر مبنی معروف رواج یا ریاست کے قانونی ضابطوں کی صد ہے۔ قدیم ادوار میں قانون قدرت اور معروف رواج کا کوئی واضح تعلق اور مفہوم نہیں تھا تاہم مغربی ثقافت ستر ہوئی صدی تک ارسطو کے خیالات سے بہت متاثر رہی۔

تیسرا اور چوتھی صدی ق.م۔ میں منطق سے بے بہرہ فاسیوں (Sophists) نے کہا کہ انسانوں کو خیر اور شر میں تمیز کو سامنے رکھ کر فطری اخلاقیات کی روشنی میں پھولنا اور پھولنا چاہیے۔ ضبط نفس کے حامی رواقی فلسفیوں (Stoics) نے تیسرا صدی ق.م۔ میں ایک فطری اعتقاد کی موجودگی کو قبول کیا جس کو تمام ممالک کے لوگ مانتے تھے۔ قانون قدرت میں دنیا میں ایک معتبر اخلاقی ضابطہ تھا۔ رومیوں نے نظریہ قانون قدرت پر بہت کم توجہ دی۔ لیکن رومی قانون نظریہ قانون قدرت (معروف رواج) کی عملی شکل تھے۔ رومیوں نے عدالتی نظام اور ادارے قائم کئے۔ یہ عدالتی نظام ایسے معاملات نمائانے کے لیے نہیں بنایا گیا جنہیں آج انسانی حقوق کہتے ہیں۔ بلکہ اس نظام کا مفروضہ یہ تھا کہ ہر فرد ایک سماجی رشتہ پر متفق ہے اور عدالتی انصاف اسی کی روشنی میں ہوگا۔

يونانی شہری نظام میں قانونی ماہرین کی کوئی جماعت موجود نہ تھی اس کے برعکس رومیوں کے پاس ماہر قانون دان اور محضطہ بیکی کا نظام موجود تھا۔ رومنی اقوام کا قانون، گذشتہ قبائلی دیوانی قانون کی ایک ترقی یا نتہ شکل تھی جس کی بنیاد قانون قدرت تھا جو تمام رومیوں اور غیر رومیوں پر لاگو ہوتا تھا۔ مشرق کے جنگجوؤں کے لگاتار حملوں نے یورپ کو طویل پستی میں دھکیل دیا جس کوتاریک دور کے نام سے جانا جاتا تھا۔

کچھ مفکرین کا خیال ہے کہ پانچویں صدی عیسوی میں شمالی افریقہ سے تعلق رکھنے والے مقدس اگسٹین کی تعلیمات کے زیر اثر یورپ نے دور جہالت کے دوران قانون کے ذریعے حکومت کے تصور کو محفوظ کرنے کی کوشش جاری رکھی۔ اُن کا خیال ہے کہ الہی اور فطری قانون ہی بالآخر سیکولر قوت کا مأخذ بنا۔

زمانہ و سطی:

گیارہویں سے تیرہویں صدی کے دوران یورپ میں ایک اتحاد موجود تھا جس کی بنیاد مشترک عقیدہ تھی۔ اس دور میں مذہبی قانون کو قدمی قانون قدرت کی حیثیت میں تسلیم کر لیا گیا۔ اس دور کے مفکر اور علم الہیات کے ماہر تھامس ایکونیس نے قانون قدرت اور معروف رواج کو الہی قانون کے تابع قرار دیا۔ اس کے مطابق معروف رواج، مشترکہ بھائیت کے ادراک سے جنم لیتا ہے اور جو قانون قدرت کی حدود میں ہوتا ہے۔ اگر کبھی معروف رواج سے قانون قدرت کی خلاف ورزی ہو تو فرد کے لیے اس کو مانا ضروری نہیں۔ مقدس تھامس نے لکھا کہ قانون قدرت ایک منطقی مخلوق (انسان) کے ازلی قانون کو تسلیم کر لینے کے سوا کچھ نہیں ہے۔ الہی قانون کو منطق اور صحائف دونوں میں تلاش کیا جاسکتا ہے۔ سینٹ تھامس نے قانون قدرت کے بنیادی اصولوں کو تین گروہوں میں تقسیم کیا۔

- خدا اور ہمسائے سے پیار، جو بنیادی طور پر اچھائی کی ترغیب اور برائی سے پہیز سے متعلق ہے۔
- دیگر اصول جو دس احکام (موسیٰ شریعت) میں موجود ہیں۔
- اور مذکورہ بالا دو اصولوں پر مبنی انصاف کے لیے ٹھوس قوانین۔

تحامس ایکوپیس کے خیالات کا اٹھارویں صدی تک یورپ کی سیاسی فکر پر نمایاں اثر تھا۔ اُس نے شخصی حقوق کے بجائے سماجی فرائض کے نظریے کو پیش کیا زمانہ و سلطی میں سماجی فرائض کی بحث اس وقت کے معاشرتی مفادات کی آئینہ دار تھی۔ ایک جاگیر دارانہ معاشرہ جو تین نمایاں طبقات، سردار یا جاگیر دار، مذہبی طبقہ اور زرعی غلام پر مشتمل تھا۔ معاشرے میں ذمہ داریوں اور فرائض کا تعین خواص کرتے تھے اور حقوق کی بجائے فرائض کی ادائیگی اور سماجی یگانگت پر زور دیا جاتا تھا۔ انسانی حقوق کو کچھ اہمیت اس وقت ملی جب زمانہ و سلطی کے یورپ میں سماجی اتحاد میں دراثت آئی جو انفرادیت پسندی کے نظریہ کی مقبولیت کا نتیجہ تھی۔ یہ بات واضح ہوئی کہ فرد کی آزادی اور معاشرے کے مفادات میں نکراہ موجود ہے۔ مندرجہ ذیل چار روحانات نئی سوچ (انسانی حقوق) کا مأخذ بنے۔

- 1- قوم پرستی (نیشنلزم) کے نتیجہ میں آنے والا سیاسی بحران، زمانہ و سلطی کے معاشرے کا زوال اور قومی ریاست کا قیام۔
- 2- کلیسیائی بحران پر ٹھنڈٹ اصلاحات جس سے کلیسیا کا اقتدار تقسیم ہوا۔
- 3- سائنسی ترقی جس سے دنیا سے متعلق منطقی اور سائنسی نقطہ نظر پروان چڑھا۔
- 4- تمام تاریخی نظریات کی اصلاحات پر سوال کئے جا رہے تھے اور اخلاقی معیارات سے متعلق بڑھتی ہوئی بیداری اور شعور کی وجہ سے ایسے اخلاقی معیارات کا مطالبہ جو کلیسیائی اور الہامی مذہب کے احکامات سے مشروط نہ ہوں۔

قدیم نظریہ

سوہیویں صدی میں اطالوی مفکر میکاولی نے ایک ایسی مادی سوچ کی وکالت کی جو فلسفے اور علم الہیات دونوں سے آزاد تھی۔ اُس کے نزدیک انسانی حاکم ہی عظیم قوت تھی۔ سترھویں صدی تک فلسفہ کی بجائے عدالتون کے ذریعے سے قانون قدرت کو تثنیل دیا گیا۔ سترھویں صدی میں ولندریزی ماہر قانون ہو گوئے کلیسیا اور صاحائف سے ہٹ کر اخلاقی معیارات کا مجموعہ ترتیب دیا۔ اُس نے قانون قدرت سے متعلق رواقی نظریہ (Stoics Idea) کو رومنی قانون اور مسیحی الہیات میں ضم کر کے اُس میں جدت پیدا کی اور 'معاہدہ عمرانی'

کا خیال پیش کیا۔ معاهدہ عمرانی کے مطابق اپنی فطرت کے سبب افراد ایک دوسرے کے ساتھ ایک معاهدے یا سمجھوتے کے تحت سماج کی تشکیل کرتے ہیں۔ ‘انسانی فطرت بنیادی طور پر اچھی ہے، ہو گو کے اس خیال کے برعکس تھامس ہابز قتوطیت پسند تھا وہ انسانی فطرت کے بارے میں شکوہ رکھتا تھا اور ہابز کا خیال تھا کہ انسان ذاتی تحفظ کی خواہش کے زیر اثر ہے لہذا وہ قانون قدرت کے بجائے فطری حق بقا کے نظر یہ کام قلد تھا۔ تھامس ہابز کے مطابق چونکہ لوگ اپنی زندگی کے تحفظ کی ضرورت محسوس کرتے ہیں لہذا انسانی خود غرضی اور جبر سے تحفظ کے لیے خود کو رضا کارانہ طور پر کسی مقدار اعلیٰ کے تابع ہو کر اُس کے قوانین کے پابند کر لیتے ہیں۔ جان لاک نے قانون منطق (Law of Reason) کی حمایت کی۔ اُس نے قانون قدرت کے مذہبی تصور کو ایک جدید سیکولر انسانی حقوق کے تصور میں ختم کر کے معاهدہ عمرانی کی ایک معتدل شکل پیش کی جس کے مطابق افراد صرف قانون اور تحفظ سے متعلقہ ضرورتوں کے تابع ہوتے ہیں۔ باقی فطری حقوق بنیادی اور حتمی ہیں مثلاً زندگی کا حق، ذاتی جائیداد کا حق اور مذہبی آزادی۔ جان لاک کے نظریات کی تھامس جیفرسن اور امریکہ کے اعلان آزادی پر گھری چھاپ نظر آتی ہے۔

برطانوی تشکیلی مکتبہ فکر کے مقلد ڈیوڈ ہیوم نے انسانی حقوق کو بشریت اور انسانی سماجی حصہ سے اخذ کیا۔ یہ انسانی حقوق کی انہائی مبہم بنیاد تھی تاہم کئی انسانی رویوں میں نظر ضرور آتی ہے۔

جین جیکووس روسونے دعویٰ کیا کہ آزادی اور مساوات ‘منطق’ سے پہلے موجود تھے تاہم معاهدہ عمرانی کے ذریعے لوگوں نے اپنے فطری حقوق کو معاشرے کی تحویل میں دے دیا۔ انسانی حقوق سے متعلق دیگر ابتدائی مصنفوں میں برطانوی مفکر جان سٹیورٹ مل اور امریکی تھامس پین شامل ہیں۔ جان سٹیورٹ مل کی مضامین آزادی (Eassey on liberty) اور تھامس پین کی حقوق بشر (The Rights Of Man) دو اہم کتابیں مظہر عام پر آئیں۔

انیسویں صدی تک انسانی حقوق کے کئی اہم موضوعات سامنے آچکے تھے۔ غلامی،

جب جری مشرقت، نامناسب اُجرت اور سخت حالات کار وغیرہ۔ ان نظریات نے سماجی فرائض اور اداروں پر مبنی معاشرتی ڈھانچے کو مکروہ کرنے میں کردار ادا کیا۔ کلیسا میں تقسیم سے بھی حقوق کی بات آگے بڑھی کیونکہ لوگ کسی شکایت کی صورت میں ریاست سے اپیل کرنے لگے۔ حقوق کی قانونی شکل میں تدوین کا آغاز شاہی فرمانوں اور جاگیرداروں کی مجلسوں کے درمیان سمجھوتوں سے ہوا۔ 1188ء میں پین کی سلطنت لیون (Leon) کی مجلس میں شاہ الفونسو نهم نے بہت سے حقوق کی توثیق کی۔ مثال کے طور پر مقدمہ کی باقاعدگی سے ساعت اور ملزم کا عزت نفس کا حق۔ ان سمجھوتوں میں سب سے مشہور میکنا کارٹا یعنی عظیم چارٹر تھا جو بادی النظر میں عام لوگوں اور غلاموں کے حقوق کے برعکس جاگیرداروں اور سرداروں کے مقادات کا تحفظ کرتا تھا۔

سترھویں صدی میں عدالتوں میں زیادہ تر معروف رواج کا تعین کرنے کے لیے قانون قدرت کو استعمال کیا گیا۔ عدالتوں نے انصاف کے دائیٰ اصولوں کی بات کی جن کی تو قیر ہر حکومت کا فرض قرار پایا۔ اٹھارہویں صدی میں امریکہ کے اعلان آزادی (1776ء) میں قانون قدرت کے نفاذ پر بہت زور دیا گیا اور امریکی آئین پر بھی اس کے اثرات مرتب ہوئے۔

انیسویں اور بیسویں صدی میں نئے سائنسی دور میں تقدیدی شعور کے باعث قانون قدرت کے نظریات پر تقدیم ہوئی البتہ بعد ازاں کئی فلسفیوں نے ’فطری حقوق‘ کی تشریح پیدا کی حقوق کے پیرائے میں کی۔

معاہدہ عمرانی کا جدید تصور

نظریہ معاہدہ عمرانی کو جدید دور (1971ء) میں پروفیسر جان رائز نے اپنی کتاب ’نظریہ انصاف‘ کے ذریعے زندہ کیا۔ اس کتاب میں حقوق و فرائض کا تعین اور فرائض کی تقسیم کے طریقہ کاربتنے کی کوشش کی گئی۔ سوال یہ تھا کہ مساوات کی موجودگی میں انصاف کے معیارات کیا ہوں گے۔ فرض کریں تمام لوگ معاشرے میں اپنے سماجی اور معاشری مرتبے سے

ناواقف ہیں تو اس صورت میں وہ انصاف کے کون سے اصولوں کا انتخاب کریں گے؟ یہ اصول دو ہیں۔

-1 بنیادی حقوق اور فرائض کی تفویض میں مساوات یا مساوی آزادی ہوگی۔

-2 سماجی اور معاشری تعصبات، صرف ایسے اقدامات کی حد تک قابل قبول ہیں جو محروم طبقات کو مساوات دلانے کے لیے کئے جائیں۔ نیز معاهدہ عمرانی کے اصولوں کی تشكیل منطقی طرزِ فکر کے افراد کرتے ہیں۔ اجتماعی مفاد کے کلیے کے پیش نظر پروفیسر جان نے 'جانز' کو انصاف قرار دیا۔ جان رائز کے نظریات پر ہونے والی تقدیم یہ ہے کہ!

(الف) لوگ اپنی اصلیت میں منفرد ہیں ہر ایک شخص مقصود بالذات یونٹ ہے جو دوسروں سے بالکل متأثر نہیں ہے لیکن درحقیقت کوئی بھی اس قدر تنہ رنگی نہیں گزار سکتا اس لیے تمام افراد کچھ گروہوں کے ارکان کی صورت میں رہتے ہیں (خاندان، معاشرہ، نہجہب، قوم، نسل)۔ یہ نظریہ گروہوں اور طبقوں کی اہمیت کو نظر انداز کرتا ہے۔

(ب) یہ ضروری ہے کہ لوگوں کے پاس اپنی معاشرت اور تاریخ سے متعلق عمومی معلومات ہوں، علاوہ ازیں وہ اس امر سے بھی آگاہ ہوں کہ معاشرے میں مختلف سماجی گروہوں میں مفادات کا شدید تکرار پایا جاتا ہے لیکن اس بات کو ماننا پڑے گا کہ ان میں سے کچھ اختلافات ناقابل معاہمت ہو سکتے ہیں اور یہ ممکن ہے کہ امیر طبقے کے گروہوں کے اراکین محروم طبقات کے مفاد کے لیے اپنے استحقاق سے دستبردار نہ ہوں۔ جان کا نظریہ عملیت پسندی کی مثال ہے جس کی بنیاد استدلال یا روشن خیال شخصی مفاد پر ہے۔ پروفیسر برائے بیری نے جان کے نظریے کی شدید مخالفت کی اور لکھا کہ جان کا بیان کردہ اصول صرف اُسی صورت میں معتبر ہو سکتا ہے جب کسی فیصلے کا بنیادی مفروضہ درست ہو۔ علاوہ ازیں یہ اصول صرف جان کے بیان کردہ مخصوص حالات میں ہی قابل قبول ہوں گے۔ پروفیسر برائے بیری

‘غیرجانبدارانہ انصاف’ کی تائید کرتا ہے۔ وہ یہ ماننے سے انکاری ہے کہ انصاف پسند لوگ محض ذاتی مفاد کی بنا پر سرگرم عمل ہیں۔ نہ ہی یہ درپرده جہالت ہے۔ چونکہ ہر کسی کے موقف کو خاطر میں لانا ضروری ہے۔ لہذا قرین انصاف وہی بات ہے جو غیرجانبداری کو راہنمای اصول بنائے۔

کتابیات:

- | | |
|---|---|
| 1 | پینگوئین۔ ہستری آف ارلی انڈیا، پینگوئین 2003 |
| 2 | امریتیا سین۔ دی آر گومینٹیو انڈیا، ایلین لین 2005 |

فرہنگ

1810ء سے 1750ء قم) دور حکومت 1792-1750 قم	حمورابی بادشاہ
(304ء سے 232ء قم) دور حکومت 268-232ء قم	اشوٹ اعظم
(1542ء سے 1605ء) دور حکومت 1556ء تا 1605ء بم	شہنشاہ اکبر
قدیم ہندو رسم جس میں بیوی شوہر کے مرنے پر اس کے ساتھ ہی چتا میں جلائی جاتی تھی۔ اس زمان کو سارکاری طور پر 1829ء میں انگریز دور حکومت میں ختم کیا گیا۔	ست
مفکر (Homer) 9ویں صدی قم	ہومر
مفکر اور فلاسفہ (Socrates) 469ء سے 399ء قم	سترات
فلسفہ (Plato) 429-347ء قم	افلاطون
فلسفہ (Aristotle) 384ء سے 322ء قم	ارسطو
آرچ بیپ (وفات 604ء)	حضرت اکٹھیں
مفکر اور علم الہیات کا استاد (74-1225ء)	خامس ایکوینس
16ویں صدی میں شاہ برتانیہ کے زیر اثر پاپے روم سے علیحدہ کلیسیا (فرقہ) کا وجود میں آنا۔ نئی مذہبی رسم اور سوچ کے ساتھ ساتھ کلیسیائی احکامات پر سے پاپے روم کے سیاسی اثر ختم کرنے کی تحریک	پروٹسٹنٹ اصلہ حات
300 صدی قم۔ یونان سے شروع ہونے والا مکتبہ فکر (Stoic Ideas) جس کے مطابق کائنات کا خالق قادر مطلق ہے جو علم و شعور کا منبع ہے۔ انسان اس لئے آگ کے شرارے ہیں۔ انسان کو نیکی اور فطرت کی آنوش میں پروان چڑھنا چاہیے۔ فلسفی زینو (Zeno) اس مکتبہ خیال کا باñی تھا۔	رواتی نظریہ
برطانوی مفکر 1632ء تا 1704ء	جان لاک
سکائچ مفکر اور تاریخ نویس 1711ء تا 1776ء	ڈیوڈ ہیوم
سیاسی مفکر و کارکن 1737ء تا 1809ء	خامس پین
برطانوی سیاسی مفکر 1806ء تا 1873ء	جان سٹیورٹ مل

انسانی حقوق کی جدوجہد اور اہم سنگ میل

قوموں کی زندگی میں کئی ایسے واقعات ہوتے ہیں جو ان کی سماجی، ثقافتی، تہذیبی اور مذہبی صورتحال پر گھرے اثرات مرتب کرتے ہیں۔ واقعات کسی تحریک کو بھی معوال اور موثر بنانے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ انسانی حقوق کی جدوجہد میں بھی کئی واقعات رونما ہوئے جو تاریخ میں اہم سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان واقعات کی دوسری خوبی یہ تھی کہ ان سے حقوق کی ایسی روایت نے جنم لیا جس نے دیگر معاشروں کو بھی متابڑ کیا۔ تیسرا خوبی یہ ہے کہ ان ثابت روایات کا اثر آب تک چلا آتا ہے۔ حقوق کی بحث انہی کے طفیل آگے چلی۔ ان اہم واقعات میں انسانی ادراک اور آزادی کی تربپ نے بالآخر کسی قانون کی شکل اختیار کی اور نتیجہ کسی حق کے تسلیم ہونے کی صورت میں نکلا۔ آئینے مندرجہ ذیل واقعات کا حصہ ترتیب جائزہ لیتے ہیں۔

1215ء	میگنا کارٹا
1679ء	☆ برطانوی جنس بے جا کا قانون
1689ء	☆ حقوق کا برطانوی بل
1776ء	☆ امریکی آزادی کا اعلامیہ / منتشر
1789ء	☆ فرد اور شہری کے حقوق کا اعلامیہ
1848ء	☆ اشترائی منتشر
1945-46ء	☆ نیورن برگ میں جنگی جرائم کے مقدمات
1964ء	☆ امریکی شہری حقوق کا ایکٹ
	میگنا کارٹا

ایک لمبی بحث کے بعد انگلینڈ کے شہر رنی میڈ (Runnymede) میں ایک چارڑر

پاس ہوا جو حقوق کی تاریخ میں ایک اہم موڑ ثابت ہوا اور آگے چل کے اس چارٹر نے مختلف مغربی ممالک میں آئین سازی کی تشکیل میں اہم کردار ادا کیا۔ چارٹر کو 1216ء کے اوائل میں تیار کیا گیا۔ چونکہ اس کے ذریعے بادشاہ کے اختیارات محدود ہوتے تھے۔ اسے ناکام بنانے کی کوشش بھی کی گئی۔ بادشاہ (جان) نے بہت سے ٹیکس عوام پر لاگو کر رکھے تھے۔ میگن کارٹا بادشاہ کی طرف سے جنگ کے لیے عوام پر عائد اضافی محصولات، آمرانہ نظام حکومت اور رعایا سے امتیازی سلوک کے خلاف صدائے احتجاج تھی۔ اس دور حکومت (1199ء تا 1216ء) میں جنی کامیابیوں کے بعد بادشاہ نے نوابوں اور جاگیر داروں کی طاقت ہتھیا کر اپنے رسوخ میں مزید اضافہ کر لیا۔ نئے محصول کے اجراء اور زرعی فارمز پر ٹیکس اور مخالفین سے غیر انسانی سلوک نے اُسے رعایا میں ناپسندیدہ بنا دیا۔ ادھر پوپ انویں سومن نے اسٹیفن لینکن کو کھلیڑ بری کا آرچ بیش پ نامزد کیا لیکن بادشاہ نے اس تقری کی مخالفت کی کیونکہ روایت کے مطابق بادشاہ کے پاس یہ اختیار تھا کہ وہ اس عہدے کے لیے کسی پادری کو نامزد کر سکتا تھا۔ تقری کی مخالفت پر بادشاہ کو پوپ کی جانب سے مذہبی رسومات ادا کرنے سے روک دیا گیا۔ بادشاہ نے پوپ کے نامزد پادری اسٹیفن کو ملک بدر کر دیا جو 1213ء میں یورپ سے سات سال کی جلاوطنی کے بعد واپس آیا۔ اس نے نوابوں کی حوصلہ افزائی کی کہ وہ اپنے جائز مطالبات بادشاہ کو پیش کریں لیکن اُس نے ان مقاصد کے لیے تشدد کے استعمال کی مخالفت کی۔ نوابوں نے ایک مسلح بادشاہ کے خلاف تیار کی اور لندن کی سڑکوں پر مارچ کیا اور بادشاہ سے مطالبہ کیا کہ وہ 15 جون 1215ء تک میگنا کارٹا پر دستخط کرے۔

اس چارٹر کی 47 کاپیاں بنائی گئیں۔ جن میں سے چاراب تک موجود ہیں۔ بالآخر پوپ نے اس سرد جنگ میں بادشاہ کی حمایت کر دی۔ کیونکہ بادشاہ نے پوپ کو انگلینڈ اور ولیز کا علاقہ دینے نیز بیت المقدس کو آزاد کروانے کے لیے صلیبی افواج کی قیادت کرنے کا وعدہ کیا تھا۔ پوپ نے چارٹر میں عائد کرده تمام الزامات سے بادشاہ کو مستثنیٰ قرار دیا اور اگست کے وسط میں آرچ بیش اسٹیفن کو خط لکھا اور نوابوں کی حکومت کے خلاف جاری ہم میں بادشاہ کا ساتھ نہ دینے پر سرزنش کی اور حکم دیا کہ بادشاہ اور ریاست کے خلاف احتجاج کرنے والوں کو کلیسا

سے خارج کر دیا جائے جب اس نے یہ حکم ماننے سے انکار کر دیا تو اُس کو آرچ بسپ کے عہدے سے معزول کر دیا گیا۔ پوب انوینٹ سوئم نے میکنا کارٹا کوشمناک، حصیر، غیر قانونی، غیر منصفانہ اور کالعدم قرار دیا۔

1216ء میں بادشاہ کی وفات کے بعد اس کے ولی عہد کے دور میں میکنا کارٹا دوبارہ جاری ہوا اور برطانیہ کے قانون کا حصہ بن گیا۔ یوں میکنا کارٹا آنے والے وقت میں ظلم و جبر کے خلاف جدو جہد کا استعارہ اور شاہی اختیارات میں کمی کے علاوہ فرد کی آزادی کا نشان بن گیا۔

میکنا کارٹا 63 ’دفعات یا ابواب‘ پر مشتمل ہے جس کے ’طويل اور بے ترتیب‘ ہونے کا طعنہ بھی دیا گیا۔ اس میں شہریوں کے ریاست سے تعلق کے علاوہ دیگر امور بھی شامل تھے جیسے کہ آٹھویں باب میں کہا گیا کہ کسی بیوہ کو دوسرا شادی کے لیے مجبور نہ کیا جائے گا اور باب 58 میں پنس آف ولیز کے بیٹے کو ترجیحی بنیادوں پر رہا کرنے کی ضمانت دی گئی جو کئی سالوں سے کنگ جان کی قید میں مصائب جھیل رہا تھا۔ دیگر کئی دفعات کلیسیا کے حقوق کے متعلق تھیں۔ کلیسا کو اضافی نیکس سے مستثنی قرار دیا گیا۔ باب 39 چارٹر کی مشہور ترین دفعہ ہے جس میں شہریوں کے لیے یکساں قانونی کارروائی کے تحفظ کی ضمانت دی گئی۔ اس میں کہا گیا تھا کہ کسی آزاد فرد کو ہر اساح، قید، جلاوطن یا ہلاک نہیں کیا جائے گا جب تک کہ ریاست کا قانون اور انصاف کے تقاضے اس کی اجازت نہ دیں۔ جدید قانون میں اس کو ’قانون کے مطابق کارروائی‘ کہتے ہیں جس کا ہر ملزم حقدار ہے۔

جس بے جا کا قانون (Habeas Corpus)

لاطینی لفظ Habeas Corpus کا لغوی مطلب ہے تم ایک جسم رکھتے ہو۔ یہ ایک حکم ہے جو عدالت یا جج کی طرف سے اس فرد کے نام جاری ہوتا ہے جس کے زیر حراست کوئی فرد ہو کہ وہ زیر حراست شخص کو ضروری کارروائی کے لیے عدالت کے سامنے پیش کرے۔ جس بے جا کا قانون آج کل شہری حقوق میں اہم حیثیت رکھتا ہے۔ جبکہ شخص کو قانون نافذ کرنے والے ادارے گرفتار کر کے نامعلوم مقام پر قید کردیتے ہیں تو اس شخص کی

بازیابی کے لیے جس بے جا کے قانون کی مدد سے ان اداروں کو نوٹس بھیجا جاتا ہے کہ عدالت یا نج کے سامنے پیش ہو کر بتائیں کہ گرفتار شخص کو کیوں اور کس مقام پر زیر حراست رکھا گیا ہے۔ عدالت قانونی تقاضوں کے مطابق مجبوس شخص کی بازیابی کا حکم جاری کرتی ہے جب تک ایسے ٹھووس ثبوت موجود نہ ہوں جن سے ثابت ہو کہ گرفتاری قانوناً جائز تھی۔ ابتداء میں جس بے جا کے قانون کو دیگر معاشروں میں وہ پذیرائی نہیں ملی جو امریکہ اور برطانیہ میں ملی۔ جس بے جا کے قانون کو امریکی آئین میں خاص اہمیت دی گئی جس کے مطابق مساوئے جنگ یا بغاوت کی صورتحال کے اس حق کو بھی معطل نہیں کیا جاسکتا۔ تاریخ میں جس بے جا سے تحفظ کے شور کے آثار میکنا کا رثا سے پہلے بھی ملتے ہیں۔ زمانہ سلطی میں اس قانون کے ذریعے خاص مقدمات چھوٹی عدالتوں سے بادشاہ کی عدالت میں منتقل کیے گئے۔ کنگ ہنزی ہفت کے دورِ حکومت (1485ء سے 1509ء) میں اختیار مشاورتی (پریوی) کو نسل استعمال کرتی تھی۔ 17ویں صدی میں کنگ چارلس کے دور میں یہ حق غیر قانونی حراست کے خلاف بہترین حکمتِ عملی کے طور پر استعمال ہوا۔ برطانیہ میں 1679ء میں ایک قانون پاس ہوا۔ جس میں عدالت کے نج صاحبان کو چھٹیوں میں بھی عدالتی حکم جاری کرنے کا اختیار دے دیا گیا اور اس حق کا تحفظ نہ کرنے کی صورت میں متعلقہ نج کے لیے بھاری جرمانہ کی سزا مقرر کی گئی۔

آزادی کا امریکی اعلامیہ

آزادی کا امریکی اعلامیہ 4 جولائی 1776ء کو منظور ہوا۔ اسے عوامی سطح پر پہلے منظم اعلان کا اعزاز حاصل ہوا جس میں عوام کی آزاد اور منتخب حکومت کو حق کے طور پر پیش کیا گیا تا ہم اس واقعہ سے کچھ ما قبل ورجینیا کی ریاست نے بھی حقوق کا اعلامیہ جاری کیا جس کی تاریخی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ آزادی کے اعلامیہ کی تالیف میں نوجوان و کیل تھامس جیفرسن کا کردار مرکزی تھا جو انسان کے فطری حقوق اور معابدہ (عمانی) کے نظریات کے زیر اثر عوام کے حق حکمرانی کا پر جوش و کیل تھا۔ 1629ء میں انگلستان میں برطانوی حقوق کی درخواست کے بعد ورجینیا اور امریکہ کے اعلامیہ میں لکھا تھا۔ یہ سچائیاں بس یہی ہیں کہ تمام

انسان مساوی پیدا ہوتے ہیں اور انہیں خالق کائنات کی طرف سے ناقابل انتقال انسانی حقوق عطا ہوتے ہیں جیسے زندگی، آزادی، خوشی اور آسودگی کا حق۔ حقوق کی نئی تفہیم الٹھار ہو یں صدی کے جدید اور روشن خیال نظریات کی دین تھی۔ بالخصوص جان لاک کا نظریہ ریاست (معاہدہ عمرانی) جس کی وجہ سے امریکہ میں فطری حقوق کی بحث عام ہوئی۔ آزادی کے امریکی اعلامیہ کو فطری حقوق کے تصور کی جیت بھی کہا جاسکتا ہے۔ کچھ حلقة نظریہ ریاست کے انقلاب فرانس پر اثرات کو معمولی قرار دیتے ہیں لیکن زیادہ ماہرین کا اتفاق یہ ہے کہ روسو کو انقلاب فرانس سے الگ نہیں کیا جاسکتا کیونکہ روسو نے نظریاتی معاہدہ عمرانی (نظریہ ریاست) کو تاریخی شعور اجاگر کرنے کے لیے انقلاب کی تیاری میں عمدگی سے استعمال کیا۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ شخصی آزادی کے مقبول عام نظریے نے امریکی اعلامیہ میں جگہ پائی تو دوسری طرف اسی سال آدم سمٹھ کی کتاب ویلیتھ آف نیشنز میں معاشی سرگرمیوں کی آزادی کے تصورات سامنے آئے جو نویز سرمایہ داری نظام کی اساس بنے۔

فرد اور شہری کے حقوق کا اعلامیہ

یہ اعلامیہ 1789ء میں انقلاب فرانس کے آغاز میں تیار ہوا، اسے بھی انسانی آزادیوں کے ایک بنیادی دستاویز کی حیثیت حاصل ہے۔ کچھ عرصے تک انسانی حقوق اور انقلابی تحریکوں کو امرا اور چرچ کے نظام کے خلاف مراجحتی ہتھیار کے طور پر استعمال کیا گیا۔ 1793-94ء کے دوران سرکردہ انقلابی راہنماؤں سمیت ہزاروں شہریوں کی پراسرار ہلاکتوں نے عوام میں عدم تحفظ اور خوف کی فضاظم کر دی جس سے 'فرد اور شہری حقوق' اور امن کے مشن کو ناقابل تلافی نقصان ہوا۔ کسانوں اور مزدوروں کو انقلاب کا بہت کم فائدہ پہنچا۔ حد یہ کہ 1791ء میں ٹریڈ یونین پر پابندی عائد کر دی گئی، تشدد اور اخطراب کی یہ لہر کئی سال جاری رہی۔ انقلابی گروہ اپنے پسندیدہ لیڈر کو اقتدار میں لانے کی تگ دو کرتے اور نئے لیڈر پرانے لیڈران کا خاتمه کرتے چلے گئے۔

اعلامیہ کے پہلے اصول کے مطابق تمام انسان بینادی طور پر آزاد بیدا ہوئے ہیں۔
اور وہ برابر کے حقوق کے حقدار ہیں۔ (آرٹیکل نمبر 1)

ان حقوق میں آزادی، ذاتی ملکیت، انسانی عزت و احترام اور جبر کی مراجحت کا
حق شامل ہے۔ (آرٹیکل نمبر 2)

یہ اعلامیہ فطری حقوق کے تصورات سے متاثر تھا اس لیے، فطری انصاف کے
مطابق، حقوق کی فراہمی کی یقین دہانی کروائی گئی اس اعلامیہ کو 19 ویں صدی میں فرانسیسی
تاریخ دان جول میشل (Jules Michlet) نے 'عصر نوکی سوچ'، قرار دیا۔

کچھ لوگ سمجھتے ہیں کہ امریکہ میں انسانی حقوق کے نظریے کی چنگاری نے انقلاب
فرانس کو جو الگ بھی بننے میں مدد دی۔ باقی کا یہ خیال ہے کہ معاشی بدحالی اور زرعی بیداری میں
کی اور بے روزگاری جیسے عوامل نے انقلاب فرانس کی راہ ہموار کی۔ یہ انقلاب آزادی کا سفیر
ثابت ہوا۔ اس نے عوامی سطح پر لوگوں کو آزادی کا ذائقہ محسوس کر دیا۔ انقلاب کا نظریہ دراصل
جاہر حکمرانوں کے خلاف بغاوت کا اعلان تھا لیکن نئے نظریے کی پروش میں حکمرانوں کے
کردار کو نظر انداز کرنا درست نہیں، کیونکہ جاہر حکمران اگر لوگوں پر اپنا جبر و سلط قائم نہ کرتے تو
لوگوں میں یہ شعور بیدار نہ ہوتا کہ ان کو اپنی پسند کی حکومت قائم کرنے کا حق حاصل ہے۔ اس
تجربے سے انقلاب کی نئی تعریف سامنے آئی۔

'انقلاب محض سیاسی تبدیلی یا عمل کا نام نہیں بلکہ اس سے مراد انسانوں کی تخلیقی
صلاحیتوں کے امکانات کو بڑھانا ہے۔'

تاہم پوپ پائیں ششم نے اس اعلامیہ کو پاگل پن اور مادر پدر آزادی کا اعلامیہ
قرار دیتے ہوئے اس کی مذمت کی اور کہا کہ یہ 'مسخ شدہ حقوق' ہیں اور اس آزادی کے صریحاً
خلاف ہے جس سے انسان کو فطری طور پر نوازا گیا۔ پوپ نے یہ اس لیے لکھا کیونکہ اعلامیہ
میں آزادیوں اور حقوق کو مذہبی پیرائے سے ہٹ کر بیان کیا گیا تھا اور مزید یہ کہ مذہبی
پابندیوں پر کھلے عام تقدیم کی جا رہی تھی۔ اعلامیہ کے اختتامی الفاظ یہ تھے 'حقوق اور آئین کے

منافی مذہبی معیارات قابل عمل نہیں ہوں گے۔ فرانسیسی انقلاب کا ایک ورشا انفرادی حقوق کی اولیت ہے جو کہ فطری (پیدائشی) حقوق بھی کہلاتے ہیں۔ اس نئے نظام حقوق کا نام آزادی تھا۔ حقوق کی بحث نے انفرادیت پسندی کو فروغ دیا یعنی ہر انسان کے منفرد ہونے پر زور دیا گیا اور اس مطابق کو تقویت ملی کہ فرد اور شہری کے حقوق کی اہمیت دینا حکومت کی ذمہ داری ہے۔ زمانہ و سلطی میں سماجی عقاائد کو جواہیت حاصل تھی اس کی جگہ انفرادی حقوق نے لے لی۔ میمگی عقاائد میں فرد کی انفرادیت کو اہمیت حاصل تھی۔ لیکن انفرادی حقوق صرف سماجی سیاق و سپاک میں مانے جاتے تھے۔ 18 ویں صدی میں روشن خیال (لبرل ازم) اور حقوق کے نظریات ٹوب پرداں چڑھے جس سے مذہبی آزادی، نشر و اشاعت کی مکمل آزادی، آزادی رائے اور اجتماع کی آزادی کے تصورات کو تقویت ملی جو جدید جمہوریت کی اساس مانی جاتی ہے۔ جے ایں لٹز کی تصنیف ‘آن برٹی’، 1859ء میں منتظر عام پر آئی جس میں شہری حقوق اور آزادیوں کی پر زور حمایت کی گئی تھی۔

کیمونٹ مینی فیسوٹو

1848ء میں کارل مارکس اور فرائیڈرک اینگلز نے اس عنوان سے کتابچہ لکھا جس کو کیمونٹ لیگ کی بنیاد قرار دیا گیا جس میں انسانی حقوق کی سماجی اہمیت پر زور دیا گیا۔ مارکس اور اینگلز کا خیال تھا کہ اقتدار پر قبضہ کرنے کے بعد مزدوروں کی آمریت قائم ہوگی تو طبقاتی استھصال کا خاتمہ ممکن ہوگا۔ کیمونٹ مینی فیسوٹو کو 19 ویں اور 20 ویں صدی کی کیمونٹ اور سو شمسیت پارٹیوں کے اعلامیوں میں اساسی حیثیت حاصل تھی۔ فرانسیسی اور امریکی انقلاب کے علاوہ کئی مغربی ممالک اور لاطینی امریکہ حتیٰ کہ ایشیا کے ممالک میں بھی اثرات مرتب ہوئے، اس کے ساتھ ساتھ روسی انقلاب نے سیاسی اور شہری حقوق کی اہمیت کو اجاگر کیا۔ مثال کے طور پر امریکی آئین ‘آزادی رائے اور آزادی صحافت کا حق’ دیتا ہے۔ جبکہ 1918ء میں روسی آئین نے ’مزدور عوام کو آزادی رائے اور اشاعت‘ کا اختیار دیا۔



نازی کمپوں میں ہلاک ہونے والوں کی نعشیں جو اکثر یہودی اور سیاسی مخالفین ہوتے تھے

نیورن برگ میں جنگی جرائم کی عدالتیں

دوسری عالمی جنگ کی تباہ کاریوں کے ذمہ دار افراد پر مقدمے قائم کئے گئے تاکہ آنے والی نسلوں کو ایسی جنگ سے بچایا جاسکے۔ اس مقصد کے لیے 8 اگست 1945ء کو امریکہ، برطانیہ، فرانس اور سوویت یوین نے اس بات پر متفقہ فیصلہ کیا کہ قائم کردہ خصوصی عدالت میں سلامتی کو نسل کے مستقل اور غیر مستقل ممالک سے ایک ایک نجح ٹریبیوٹ میں شامل کیا جائے بعد میں اس ٹریبل (مقدمہ) میں مزید انیس ممالک کو شامل کیا گیا۔ 1945-46ء کے دوران نیورن برگ جمنی میں اس مقدمے کی سماعت ہوئی۔ اس عالمی عدالت جس کے سربراہ برطانیہ کے چیف جسٹس جیفری لارنس تھے۔ اس نے چوبیس نازی لیڈروں پر جنگی جرائم کے سلسلہ میں مقدمہ چلا�ا۔

ٹریبیوٹ کی ساعت 216 نشتوں میں ہوئی۔

مقدمے چار عنوانات (جرائم) کے تحت قائم کیے گئے۔

ا۔ امن کے خلاف جرائم (عالمی معابدوں کی خلاف ورزی کرتے ہوئے جنگ کا آغاز)

ب۔ انسانیت کے خلاف جرائم (عام شہریوں کی ہلاکت، جلاوطنی اور نسل کشی)

- ج۔ جنگی جرائم اور جنگ کے قانون کی خلاف ورزی
د۔ درج بالا جرائم کو سراجام دینے میں حصہ لینا اور سازش کرنا
نامزد 24 اشخاص کو وہ تمام قانونی تحفظ فراہم کیے گئے جو ایک منصفانہ عدالتی کارروائی کی
ضمانت دیتے ہیں۔ وکیل کے ذریعے نمائندگی گواہوں سے جرح وغیرہ کارروائی کا حصہ
تھا۔ ایک جنگی مجرم نے خود کشی کر لی، دوسرا ذہنی معدوم، ثابت ہوا، تین جنگی مجرم بے گناہ
قرار دیئے گئے، 12 جنگی مجرموں کو سزاۓ موت کا حکم ہوا۔ تین جنگی مجرموں کو عمر قید اور
چار جنگی مجرموں کو دس سے بیس سال کی قید با مشقت کی سزا سنائی گئی۔ اس کارروائی میں
اصول قانون سے متعلق چند اہم نکات سامنے آئے۔ خصوصی عدالت نے اس خیال کی
تردید کی کہ جنگی جرائم کا ذمہ دار حضن سرکاری الہکار یا ریاست کو قرار دیا جاسکتا ہے۔
2۔ یہ جرائم صرف دوسری عالمی جنگ میں سرزد نہیں ہوئے بلکہ جنگ اور امن دونوں
حالتوں میں ان جرائم کا ارتکاب ہوتا رہا ہے۔
3۔ اعلیٰ حکام کے حکم کی تعییل کو عذر کے طور پر پیش نہیں کیا جاسکتا ہے۔ اگر حکم غیر قانونی و
غیر انسانی ہے تو اسے ماننے سے انکار کرنا فرض ہے۔
اصول نئے تھے اس لیے ان کو اس وقت پذیرائی نہیں ملی۔ لیکن بعد ازاں اقوام متحده کی
بجز اس بیان نے نیورن برگ کے عدالتی فیصلے کی توثیق کر دی اور آہستہ آہستہ یہ اصول
بین الاقوامی سوچ اور قانون میں تسلیم ہونے لگے۔

امریکہ میں شہری حقوق کا قانون

1964ء میں سول رائٹس ایکٹ کی منظوری نے عام مقامات اور خدمات پر نسلی امتیازات کو ختم کیا۔ ڈاکٹر مارٹن لوٹھر کنگ نے مہاتما گاندھی کی وضع کردہ سیاسی حکمت عملی کو امریکہ میں استعمال کیا۔ علامتی ایکشن جسے ملین مارچ، ریلی، یاترا، ہڑتاہلیں اور دھرنے بھی امتیازات کے خاتمے کی اس تحریک کا حصہ رہے۔ جن سے عوامی حلقوں کی توجہ سیاہ فام لوگوں پر مسلط امتیازات کی جانب مبذول کروائی گئی اور حکومت سے مطالبے کئے گئے کہ نئے قوانین بنائے کرنے کی امتیازات کا خاتمہ کیا جائے۔ مارٹن لوٹھر کنگ کو اپنی جان کی قربانی دینا پڑی لیکن یہ تحریک کامیاب ہوئی اور نسلی امتیاز کا خاتمہ ہوا۔ یہ عدم تشدد کے اصولوں کی کامیابی تھی۔ اس

سے پہلے امریکہ میں سیاہ فام لوگوں کو سکولوں میں داخلے، سفر اور ہوٹل میں قیام کے دوران صرف ان کے لیے مخصوص جگہوں اور نشتوں میں داخلے کی اجازت تھی۔



مارٹن لوٹھر نگ، روز اپارکس نسلی امتیاز کے خلاف مارچ میں شریک

فرہنگ

پوپ انوینٹ ٹھری	1198 Pope Innocent III
اسٹیفن لینگٹن	1150 Stephn Langton
کنفر بری	جنوب مشرقی انگلینڈ کا شہر Canterbury
جس بے جا	Habeas Corpus (غیر قانونی حراست)
زمانہ و سلطی	پانچویں سے پندرہویں صدی عیسوی
انقلاب فرانس	1789ء (بادشاہت کا خاتمہ اور پہلی جمہوریہ کا قیام)
ٹریڈ یونین	مزدور تنظیمیں
اشترا کی منشور	1848 Communist Manifesto
روسی انقلاب	1917ء پہلی اشتراکی ریاست سویت یونین کا قیام
اشرافیہ	شرفا و امراء
اعلامیہ	Declaration
نازی پارٹی	20ویں صدی میں جرمی کی حکمران جماعت جس نے نسلی امتیاز پر بنی ریاستی نظام (فاشزم) لا گو کیا۔

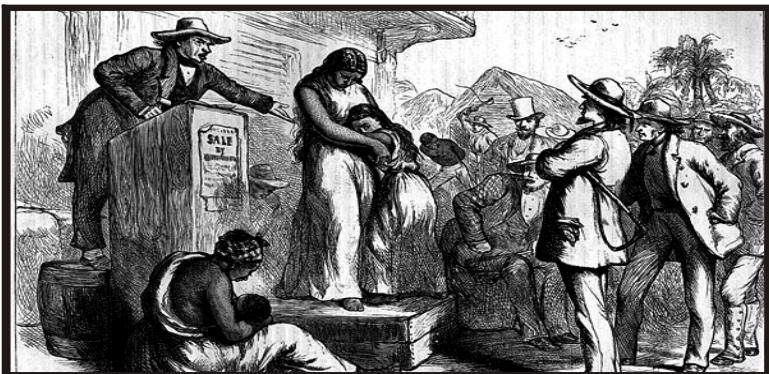
انسانی حقوق کی چند نمایاں تحریکیں

انسانی حقوق کے تصور کے ارتقا میں جہاں کچھ تاریخی واقعات اہمیت کے حامل ہیں جیسے انقلاب فرانس، دوسری عالمی جنگ اور اقوام متحدہ کا قیام نیز انسانی حقوق سے متعلق دستاویزات میں امریکہ کا اعلان آزادی اور میگنا کارٹا کی اہمیت ہے وہاں اُن تحریکوں کو بھی خاص مقام حاصل ہے جو انسانی حقوق کو تسلیم کروانے کی جدوجہد کا حصہ رہیں۔ عالمی سطح پر انسانی حقوق سے آگاہی اور سماجی بیداری کے لیے جن تحریکوں نے اہم کردار ادا کیا اُن میں مندرجہ ذیل خصوصی اہمیت کی حامل ہیں۔

- غلامی کے خاتمه کی تحریک
- نوآبادیاتی نظام کے خلاف تحریک آزادی
- مزدوروں کے حقوق کی تحریک
- امریکی سیاہ فاموں کی مساوی حقوق کی تحریک
- سول نافرمانی کی تحریک

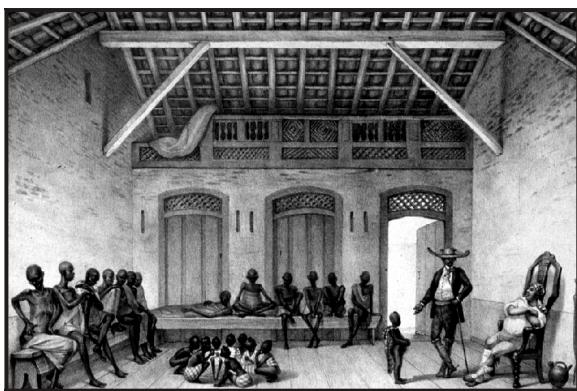
غلامی کے خاتمه کی تحریک

تاریخی اعتبار سے حقوق کو تسلیم کروانے کی جدوجہد میں ایک ابتدائی کامیابی غلامی پر پابندی کا قانون بننا تھا۔ غلامی کا سلسلہ چین کے شاگنگ شہنشاہوں (اٹھارہویں سے بارہویں صدی قم) سے چلا اور بیسویں صدی تک جاری رہا۔ چین میں غلاموں کے استعمال کا رواج تو موجود تھا مگر غلاموں کی تجارت نہیں ہوتی تھی۔ حمورابی (بابل) قوانین کے مطابق مفرور اور جلاوطن غلاموں کو پناہ دینے پر موت کی سزا مقرر تھی۔ اسی طرح برصغیر کے بادشاہ منوئے سنکرتی ضابطے لکھوائے جو دوسری صدی قم اور دوسری صدی بم کے دوران شاستر (قوانین) کہلائے۔ ان قوانین سے ظاہر ہوتا ہے کہ غلامی سماج میں ایک ادارہ بن چکی تھی۔



انسانوں کی بولی لگتی تھی اور قانوناً اس پر کوئی روک ٹوک نہ تھی

غلام کا حقیقی مطلب یہ تھا کہ غلام انسان نہیں ہے اس کی حیثیت ایک جانور کی سی ہے۔ جنین باشا نے چھٹی صدی میں غلام کی تعریف کو ان الفاظ میں بیان کیا کہ قوموں کے قوانین کے مطابق ہر وہ شخص جو فطرت کے اصولوں سے برکس ہو گا وہ دوسروں کی ملکیت میں ہو گا۔ غلام اپنے آقاوں کے رحم و کرم پر ہوتے تھے۔ زمانہ قدیم میں غلاموں کا استعمال گھریلو کام کا رج، زرعی پیداوار اور زمین دوز کانوں میں ہوتا تھا۔ غلاموں کے فرار اور بخاوت کے واقعات عام تھے۔ سلطنتِ روما اور یونانی تہذیبوں میں بھی غلامی کو معیوب نہیں سمجھا جاتا تھا۔ عظیم یونانی فلاسفہ ارسطو نے بھی غلامی کی مخالفت نہیں کی مگر وہ اپنی ایک تحریر میں لکھتا ہے کہ ایسے فلاسفہ بھی موجود ہیں جن کے نزدیک یہ فعل ایک نا انصافی اور فطرت کے اصولوں کے



برازیل کے شہر ریو میں غلاموں کی ایک مارکیٹ کا منظر

منافی ہے۔ مگر رواتی فلاسفوں نے کبھی غلامی پر پابندی کا مطالبہ نہیں کیا تھا۔ سلطنت روما میں پہلی اور دوسری صدی ق م سے غلام سنتے اور عام دستیاب تھے۔ غلامی کے ابتدائی دور میں بھری تزاق، انخوا کار اور بردہ فروش غیر ترقی یافتہ علاقوں سے انسانوں کو قید کر کے تجارتی منڈیوں میں فروخت کرتے تھے۔ سلطنت روما میں غلامی کو انسانی کی بجائے بدصیبی سمجھا جاتا۔

دیگر ادوار میں برا عظم ایشیا، یورپ، امریکہ اور مشرق وسطی میں غلاموں کی منڈیاں ہوتی تھیں۔ اُس دور میں اخلاقی سطح پر غلامی کی مذمت یا انسانی تجارت میں ملوث لوگوں کی حوصلہ شکنی نہیں کی گئی جس سے یہ برائی پروان چڑھتی رہی۔ انہیاں نے لوگوں کو تلقین کی کہ غلاموں سے اچھا برتاؤ کیا جائے اور نیک عمل کے نتیجے میں غلاموں کو رہا کیا جائے۔ سیاہ فام غلاموں کی بڑھتی مانگ کے پیش نظر افریقیہ سے جبشی غلام بنانا کر لائے جاتے تھے۔ 1950ء سے 1950ء تک تقریباً اٹھارہ ملین افریقیوں کو انسانی تجارتی منڈیوں میں فروخت کیا گیا۔

7 اکتوبر 1482ء کو پوپ پاوس دومن نے پرتگالیوں کو انسانی تجارت جیسے مکروہ کاروبار کرنے پر تقدیم کا نشانہ بنایا مگر بعد ازاں 1517ء میں پروٹسٹنٹ فرقے کی تحریک اصلاح، ملکیسا کے حصول اقتدار کی کاوشیں اور دیگر دنیاوی معاملات میں بڑھتے رہجنات کی وجہ سے غلامی جیسی برائی کی مخالفت نہیں کی گئی۔ یورپی باشندوں نے 1450ء سے لے کے 1868ء تک ستر لاکھ افریقیوں کو انسانی تجارت کے ذریعے امریکہ پہنچایا۔ قرون وسطی میں رعایا اور غلام دونوں کی حالت ناگفته بہتھی کیونکہ اُس دور کے آقا (حاکم) ان دونوں کو کم تر اور حقیر گردانے تھے۔ رعایا اور غلاموں کا آقاوں پر انحصار جاری رہا۔ غلامی جیسے غیر انسانی فعل سے نجات کی امید اس وقت پیدا ہوئی جب عالمی سطح پر معاشری تبدیلی، زرعی ترقی اور طاعون جیسی وباوں نے جا گیر داری اور اجارہ داری کو مزارعت کا نظام قبول کرنے پر مجبور کر دیا۔ اُس دور میں زراعت میں توسعیں کا دارو مدار غلاموں پر تھا۔ اس کا آغاز (1492ء) سپین کے جنوبی امریکہ پر قبضے کے بعد ہوا۔ ہسپانوی باشندوں نے مقامی انڈین مزدو روں کو زرعی پیداوار کے لیے استعمال کرنا شروع کیا کیونکہ وہاں زمین خنک اور بخوبی تھی۔ کانوں میں کام کرنے والے

انڈین لوگوں کی حالت زرعی غلاموں سے زیادہ قابل رحم تھی۔ اُسی دور میں جنوبی امریکہ کے پکھمذہبی راہنماؤں نے سولہویں صدی میں تجویز پیش کی کہ انڈین غلاموں کو سخت مشقت سے نجات دلانے کے لیے سیاہ فام افریقیوں کو کاشتکاری کے لیے درآمد کیا جائے کیونکہ سیاہ فام افریقی سخت جان سمجھے جاتے تھے۔

جہشی غلاموں کی تجارت کا آغاز کیریں (ویسٹ انڈیز اور مشرقی سنٹرل امریکہ، شمالی جنوبی امریکہ کے درمیان) جزیرے سے ہوا اور جلد ہی یہ تجارت کئی اور جزریوں میں پھیل گئی۔ برطانوی علاقوں میں ان کی آدمسترن ہویں صدی اور اٹھارہویں صدی تک جاری رہی جس کے نتیجے میں اٹھارہویں صدی کے آغاز میں غلاموں کی تعداد نو آبادکاروں سے تجاوز کر گئی۔ غلامی میں کمی اُس وقت شروع ہوئی جب تمباکو کی بجائے کپاس کی پیداوار میں اضافہ ہو گیا۔

گویا زرعی ترقی مزدوروں اور غلاموں کے لئے سہولیات لائی۔ غلاموں کی تجارت میں فرانسیسی، پُرتگالی اور ولندیزی شامل تھیں لیکن برطانوی باشندے اس کاروبار میں سب سے زیادہ ملوث رہے۔ 1860ء کی امریکی خانہ جنگی کے دوران 1830ء میں 4,441 غلام شمار کئے گئے۔ 1871ء میں کوئی زیافرینڈز آف سوسائٹی کا قیام عمل میں لا یا گیا۔ اس جماعت کا آغاز برطانیہ میں ہوا۔ اس نے غلامی کے خاتمے کے لئے موثر تحریک شروع کر دی۔ جس کے نتیجے میں اٹھارہویں صدی کے آخر تک امریکی معاشرے میں غلامی کو معیوب سمجھا جانے لگا اور غلامی کے خاتمے کی ضرورت پر زور دیا جانے لگا۔ امریکی انقلاب کے بانیوں نے غلامی کی مذمت کرتے ہوئے اس پر پابندی کا مطالبہ کیا۔ شمالی امریکی ریاستوں نے غلامی پر پابندی عائد کی جبکہ زراعت پر انحصار ہونے کی وجہ سے جنوبی ریڈ انڈیز اور لاٹین امریکہ کے ممالک نے غلامی پر پابندی عائد نہیں کی۔

1787ء میں اندادِ غلامی سوسائٹی قائم کی گئی جبکہ کوئی زکر کے ممبران اس سوسائٹی میں نمایاں کردار ادا کر رہے تھے۔ 1807ء میں امریکہ اور برطانیہ نے انسانی تجارت پر پابندی عائد کی۔ 1833ء میں امریکہ میں اینٹی سلیوری سوسائٹی کا آغاز ہوا اور 1839ء میں یہ سوسائٹی

برطانیہ میں قائم کی گئی۔ امریکی خانہ جنگلی کے دوران سیاہ فام جنگجوں کے کردار نے ایسی فضا ہموار کر دی کہ صدر ابراہام لنکن غلامی پر پابندی کے لئے عملی اقدامات کر پائے جس کے نتیجے میں امریکی آئین میں تیرھوں ترمیم (1863ء) کی صورت میں غلامی پر مکمل پابندی عائد کی گئی۔ روس نے 1861ء میں زرعی غلاموں کو آزاد کیا۔ ایشیا میں تھائی لینڈ کے بادشاہ نے 1874ء میں غلامی پر پابندی لگادی۔ غلامی پر پہلی مرتبہ بین الاقوامی سطل پر پابندی 1814ء میں پیرس معاهدہ امن میں لگائی گئی۔



نیلسن منڈیلا کے برطانیہ میں مختصر قیام کے دوران دوستوں نے انھیں مشورہ دیا کہ وہ جنوبی افریقہ نہ جائیں۔ کیونکہ ان کی گرفتاری یقینی تھی۔ منڈیلانے یہ مشورہ نظر انداز کر دیا کیونکہ وہ نسلی امتیاز کے خاتمے کے لیے ہر قربانی دینے کا عزم کر چکے تھے۔

لیگ آف نیشنز نے 1926ء میں ایک عالمی انسداد غلامی کنوینشن (دستاویز) تیار کی اور جن ممالک نے اس معاهدے پر و تخط کیے انہوں نے عہد کیا کہ وہ فوری طور پر اپنے ممالک میں غلامی کے خاتمے کے لیے عملی اقدامات کریں گے۔ انسداد غلامی کنوینشن کی اہمیت کے پیش نظر ایک اضافی کنوینشن کو سماجی اقتصادی کوئسل کے ذریعے پاس کیا گیا جس میں قرض کی ادائیگی نہ کرنے پر قید، بیگارکمپ، دہنوں کی خریداری اور بچوں کی مشقت پر پابندی لگائی گئی۔ لیگ آف نیشنز نے مہاجرین کے مسائل کو بھی اٹھایا البتہ جری مشقت کے معاملے کو آئی ایل او کے سپرد کر دیا گیا۔

1930ء میں آئی ایل او نے ایک کنوینشن کے ذریعے جری مشقت پر پابندی عائد کی۔ جس کی رو سے جری مشقت کی تعریف یوں کی گئی۔ کسی بھی شخص سے ایسی مشقت جو سزا

کے طور پر لی جائے یا جس کے لئے وہ رضا کارانہ تیار نہ ہو جری مشقت ہے، تاہم اس کنوینشن میں جری مشقت کی کئی شکلیں نظر انداز ہو گئیں۔ نازی کیپیوں (جرمنی) میں قیدیوں سے ناروا سلوک کی شکایات عالمی سطح پر نمایاں ہوئیں تو جری مشقت کا مسئلہ دنیا کی توجہ کا مرکز بن گیا۔ جری مشقت کو سیاسی مخالفین کے خلاف استعمال کیا جاتا تھا، بعد ازاں اس کو اقلیتوں بالخصوص یہودیوں کے خلاف استعمال کیا گیا۔ رو سیوں اور جرمنوں نے جتنی قیدیوں کو بیگار کے لئے استعمال کیا۔ پھر انسانی حقوق کا عالمی اعلامیہ آیا جس کے آڑیک 4 میں یہ اصول وضع کیا گیا ہے کہ کوئی شخص غلام یا لوڈی بنا کر نہ رکھا جائے گا۔ غلامی اور بردہ فروشی کی ہر شکل منوع ہوگی۔



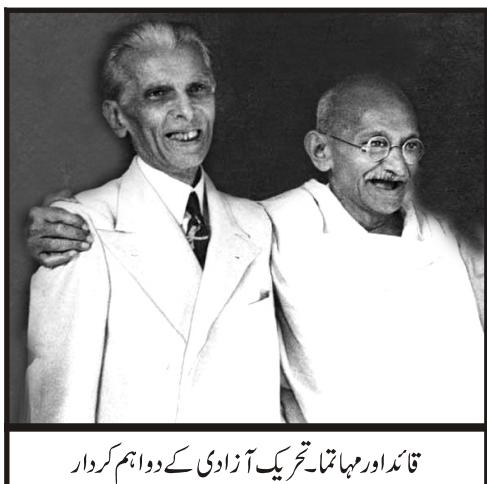
جاتی ہے۔ سعودی عرب میں غلامی کے خاتمے کے لئے 1936ء میں قانون تشكیل دیا گیا۔

نوآبادیاتی نظام کے خلاف تحریک آزادی

پدر ہویں صدی کے آخر میں جغرافیائی حدود کی توسعیں میں ایک نئے رہنمائی کا اضافہ ہوا جس میں امیر اور ترقی یافتہ ممالک نے پسمندہ اور غیر ترقی یافتہ ممالک میں نوآبادیاتی نظام قائم

کیا۔ ہسپانوی، پرتگالی، فرانسیسی، برطانوی، ولندیزی اور جرمنوں نے کمی نوآبادیاں قائم کیں۔ سیسیل جان روڈز جس نے آسکفورو یونیورسٹی میں روڈز سکالر شپ قائم کیا اس کا شمار نوآبادیات کے وکیلوں میں ہوتا ہے۔ اُس نے بڑش ساو تھ افریقہ کمپنی کی بنیاد رکھی۔ کیپ کالونی (جنوبی افریقہ) کے اس وزیرِ اعظم کا کہنا تھا کہ انگلینڈ اور برطانیہ کی کمپنیاں دنیا کے غیر مہنبد علاقوں میں نوآبادیاتی بستیاں قائم کریں۔ نوآبادیاتی نظام کی تعریف میں اُس کے الفاظ تھے۔

دنی زمینوں کی ملائش جن کی مدد سے ہم سنتے داموں خام مال حاصل کر سکیں اور ان کے ممالک میں میسر مزدوری سے فائدہ اٹھائیں، نوآبادکاروں کے مطابق ان نوآبادیاتی بستیوں پر حکومت قائم کرنے سے فیکٹریوں کی اضافی پیداوار کی کھپت ممکن ہو سکے گی۔ یہ بیان اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ نوآبادکاروں کے پسمندہ علاقوں میں تسلط قائم کرنے کے مقاصد توسعی پسندانہ تھے۔ جنوبی افریقہ نہ صرف نوآبادیاتی نظام کا شکار تھا بلکہ رنگ و نسل کی بنیاد پر کئے جانے والے امتیاز بھی مقامی آبادی پر لاد دیئے گئے اور مذہب کی من مانی تشریحات کی مدد سے ان کا جواز پیدا کر لیا گیا تا ہم نسلی امتیاز کے خاتمے کے لئے جدوجہد جاری رہی۔ نیلسن منڈیلانے 28 سال کی اسیری سے رہائی کے بعد جمہوریت کی بحالی اور امتیازی سلوک کے خاتمے کو ممکن بنایا۔



فائدہ اور مہاتما۔ تحریک آزادی کے دو اہم کردار

فیضان، جس کو ہسپانوی
بادشاہ فلپ دوم کی وفات کے بعد
یہ نام دیا گیا، براعظم ایشیا میں
نوآبادیاتی نظام کی اولین مثال
ہے۔ تین سو تینس (333) سال
ہسپانیہ کے زیر تسلط گزارے پھر
12 جون 1898ء کو پسین اور پھر
امریکہ سے دوسری عالمی جنگ
کے بعد مکمل آزادی حاصل ہوئی
تاہم امریکی آئین کے مطابق امریکی شہری برابر حقوق رکھتے ہیں اور وہ فلپائنی عوام کے ساتھ مل کر قدرتی وسائل کو استعمال کریں گے۔

بر صغیر میں نوآبادیاتی نظام کا آغاز 1757ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی آمد سے ہوا۔ جس نے 1857ء میں انڈین سپاہیوں کی بغاوت کے بعد پورے بر صغیر میں اپنی حکومت قائم کر لی۔ 1885ء میں آل انڈیا نیشنل کانگرس نے ایک قوم پرست تحریک شروع کی۔ پھر 1906ء میں مسلم لیگ کا قیام الگ وطن کے حصول کے لئے نقطہ آغاز ثابت ہوا۔ 1886ء میں برما کو ہندوستان میں ایک صوبے کی حیثیت سے شامل کیا گیا پھر 1937ء میں الگ کر دیا گیا۔ مہاتما گاندھی اور جواہر لعل نہرو ہندوستان کی آزادی کے ہیر و جکہ محمد علی جناح پاکستان اور اوںگ سان (Aung San) برما کے بانی ہیں۔ ہندوستان اور پاکستان کو آزادی 14 اگست 1947ء کو ملی۔ برما کو 4 جنوری 1948ء کو ایشیا کے ہر ملک کے اپنے قوی ہیر و ہیں جنہوں نے آزادی حاصل کرنے کے لئے ناقابل فراموش خدمات انجام دیں۔ ان میں سے کچھ راہنماؤں نے آزادی کے حصول کی خاطر مسلح جدوجہد کا ذریعہ اپنایا تو بعض راہنماؤں نے عدم تشدد کی حکمت عملی کے ذریعہ پر ونی تسلط کا مقابلہ کیا۔

جاپان ایشیا کا واحد ملک ہے جس نے دیگر علاقوں پر اپنا تسلط قائم رکھا۔ 1853ء میں جاپان نے اردوگرد کی کمزور ریاستوں پر اپنا تسلط قائم کرنے کی منصوبہ بندی کی اور کوریا پر قبضہ کرنے کے بعد چین کا رُخ اختیار کیا۔ جاپان نے صنعتی میدان میں تیز ترقی اور نوآباد کاری میں مغرب کی نقل کی۔ جس کے نتیجے میں 1894-95ء میں جاپان اور چین کے درمیان جنگ ہوئی، اس جنگ میں جاپان نے فتح حاصل کی اور مراعات حاصل کر لیں۔ 1904-05ء میں روس کو کوریا اور منچوریا کی جنگ میں شکست دینے کے بعد جاپان نے کوریا کو 1910ء میں اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔ جاپانی عزائم کو روکنے کیلئے 1943ء میں دوسری عالمی جنگ کے دوران 'قاهرہ منشور' کے تحت امریکہ، برطانیہ اور چین نے مشترکہ معاهدہ کیا کہ کوریا کو آزادی دلائیں گے۔ جنگ کے خاتمے پر جاپان نے 38 محاذوں پر سوویت یونین سے شکست تسلیم کی جس کے نتیجے میں کوریا دو حصوں (شمالی اور جنوبی) میں تقسیم ہو گیا۔



مہاتما گاندھی لاگ مارچ میں تحریک

سول نافرمانی کی تحریک

عدم تشدد/سول نافرمانی کی تحریک کے سرکردہ لیڈروں میں موہن داس کرم چند گاندھی اور ان کے معنوی شاگرد ڈاکٹر مارش لوہر کنگ جو نیر کا نام سرفہست آتا ہے۔ عدم تشدد/سول نافرمانی کی تحریک نوآباد کارمہم جوؤں کے خلاف شروع کی گئی۔ سول نافرمانی سے مراد قانونی حدود میں سرکاری احکامات مانے سے انکار کرنا ہے اور حکومت سے مطالبات کی منظوری کے لئے پر امن دباؤ کا طریقہ کار اختیار کرنا ہے۔ گاندھی جی نے عدم تشدد کے فلسفہ کو سیاسی حکمتِ عملی کے طور پر استعمال کیا۔ گاندھی جی کا کہنا تھا کہ وہ لیوناٹی، ہنری ڈیوڈ ٹھرریو، بھگوت گیتا اور بابل کی تعلیمات سے بہت متاثر تھے۔ لیوناٹی کا شمار دنیا کے عظیم ترین ناول نگاروں میں ہوتا ہے۔ جبکہ ٹھرریو ایک امریکن شاعر، فلاسفہ اور تحریک آزادی کا محرك تھا۔ اُس نے مراجحت کے خیالات کو کتابی شکل میں 1849ء میں شائع کیا۔ سول نافرمانی کے عنوان کے تحت، اس کی کتاب A Yankee in Canada 1866ء سے 1906ء میں شائع ہوئی۔

1906ء میں گاندھی جی نے ستیاگرہ کے فلسفہ (چ کی طاقت یا طریقہ) کو

ہندوستان کی آزادی کے لئے اور ب्रطانوی سامراجی نظام کے خلاف استعمال کیا۔ آزادی کی جدوجہد میں ستیاگرہ نے سول نافرمانی اور بھوک ہڑتال کا طریقہ کار استعمال کیا۔ ماسٹر تاراسنگھ کو قوم کے حقوق تسلیم کروانے کی جدوجہد میں 1930ء سے 1966ء کے دوران 14 مرتبہ جیل جانا پڑا۔ گاندھی جی کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے انہوں نے سکھ قوم کے حقوق کے حصول کی خاطر 48 دن مسلسل بھوک ہڑتال بھی کی۔

گاندھی جی کے قربی ساتھیوں میں سے خان عبد الغفار خان (1890ء–1988ء) کو سرحدی گاندھی کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔ وہ ایک بہادر پٹھان لیڈر تھے جنہوں نے ہندوستان کی آزادی کے لئے عدم تشدد پر مبنی قومی تعمیر و ترقی کی تحریک شروع کی، اس تحریک کو سرخ پوش تحریک کا نام بھی دیا گیا۔ گاندھی جی کی طرح غفار خان نے بھی آزادی کی خاطر کئی سال جیل میں بسر کیے۔ وہ ہر دعزیز راجہنا اور عدم تشدد کے حامی تھے۔ انہوں نے عدم تشدد کی حامی ایک فوج تیار کی اور اس کا نام خدا کی خدمت گارکھا۔ یہ لوگ پٹھانوں میں تعلیم عام کرنے اور دیگر سماجی بھلانی کے کام اور انہیں تشدد سے باز رہنے کی تلقین کرتے تھے۔ انہوں نے تقسیم ہند کے موقع پر ہندوؤں اور سکھوں کی جانبیں بچانے کے لئے اپنی زندگی بھی داؤ پر لگا دی۔ 1924ء میں گاندھی جی کی عدم تشدد اور رسول نافرمانی کی تحریک سے متاثر ہو کر انڈونیشیا کے ایک گروپ نے ولندیزیوں (ہالینڈ) سے آزادی حاصل کرنے کے لئے قوم پرستی کی تحریک شروع کی۔

مساوی شہری حقوق کی تحریک

اگرچہ امریکہ میں تیہوں آئینی ترمیم کے ذریعے غلامی پر پابندی کے مطابق سیاہ فام امریکی آزاد شہری تھے۔ تاہم ان کے خلاف سماجی امتیاز اور نا انصافیوں کا سلسہ بیسوں صدی تک جاری رہا۔ نسلی امتیاز کے خلاف مراحت نے 1950ء اور 1960ء کی دہائیوں میں مساوی حقوق کی تحریک کا روپ اختیار کر لیا۔

امریکہ میں 1875ء کے شہری حقوق ایکٹ کے مطابق رنگ، نسل اور مذہب کے امتیازات کا خاتمه ہو چکا تھا۔ مگر 1883ء تک یہ قانون حکمرانوں کی عدم دلچسپی کی وجہ سے نافذ



روز اپارکس: بسوں کے بائیکاٹ کی محکم اپنے خلاف مقدمے کی کارروائی سننے کے لیے عدالت کی طرف گامز نہ ہوا۔ بعد کے کچھ قوانین میں امریکی سیاہ فاموں کے شہری حقوق غصب ہوئے۔ لہذا مساوی حقوق کا معاملہ بدستور کھٹائی میں پڑا ہوا تھا۔ 1896ء کے کیس (Plessy Vs Ferguson) میں سپریم کورٹ نے ایک تاریخی فیصلے میں نسلی تفریق کے خاتمے اور برابری کے حقوق کے فیصلے کو برقرار رکھا اور میسوں صدی کے نصف تک یہی صورت حال جاری رہی۔

1945ء میں دوسری عالمی جنگ کے خاتمے پر امریکی صدر ہیری ٹرومن نے امریکی فوج میں نسلی امتیاز کا خاتمہ کیا اور قانون سازی کے لئے نیشنل ایسوی ایش فارڈی ایڈوانسمنٹ آف ملرڈ پیپلز نامی جماعت کا قیام عمل میں آیا۔ جس نے امریکی انتظامیہ میں روش خیالی کے رجحان کو مضبوط کیا۔ 1954ء میں امریکی سپریم کورٹ نے نسلی امتیازات پر مبنی نظام تعلیم کو غیر آئینی قرار دے دیا۔ لیکن اس تحریک میں ایک زبردست ابھار اس وقت پیدا ہوا جب ایک سیاہ فام خاتون روز اپارکس کو 5 دسمبر 1955ء کو ملکگری کے مقام پر بس میں سفید فام لوگوں کے لئے مخصوص حصے میں بیٹھنے پر گرفتار کر لیا گیا۔ اس نسلی امتیاز پر کئی مہینوں احتجاج ہوا۔ ڈاکٹر مارٹن لوٹھر کنگ (البامہ بر ملکگم کے پادری) نے اس امتیازی سلوک پر اپنی پُر جوش

تقریروں کے ذریعے عوام میں ایک جذبہ پیدا کر دیا۔ امریکہ میں نسلی امتیاز کے خاتمے کے مطابق نے عوامی تحریک کا روپ اختیار کر لیا تھا۔ اس تحریک کو سفید فام شہریوں کی حمایت بھی حاصل تھی۔

ڈاکٹر کنگ نے مہاتما گاندھی کے عدم تشدد کے طریقہ کار پر عمل کرتے ہوئے سدرن کرپچن لیڈر شپ کافرنس کے ذریعے انسانی حقوق کو تسلیم کروانے کے لئے احتجاجی تحریکوں، عوامی مارچ وغیرہ کی قیادت کی۔ 1960ء میں طلباء کی جانب سے تھیڑوں، لا بھریوں، مارکیٹوں اور ڈیپارٹمنٹل سٹورز سے امتیازی سلوک کے خاتمے کی جدوجہد میں احتجاجی دھرنے بھی شروع ہو گئے۔ اگست 1963ء میں واشنگٹن ڈی سی میں امتیاز کے خاتمے کے لئے دوالاکھ افراد نے احتجاجی مظاہرہ کیا جس میں ڈاکٹر مارٹن لوٹھرنے اپنی زندگی کی پُرا اثر اور یادگار تقریر کرتے ہوئے کہا۔ ”میرا ایک خواب ہے، اُن کا خواب تھا کہ ایک دن ایسا ضرور آئے جب امریکہ اور پوری دنیا سے نا انصافی اور امتیازی سلوک کا خاتمہ ہو۔ اسی سال امن کے لئے خدمات کے صلے میں انہیں نوبل انعام ملا۔“ 1964ء میں امریکہ کا صدر لینڈن بی جانسن نے امریکی تاریخ کے دور رس اثرات کے حامل شہری حقوق ایکٹ پر دستخط کئے۔ جس کی منظوری سے رنگ و نسل کی بنیاد پر تعصب کا خاتمہ ممکن ہوا۔

1965ء میں جزل اسے میل کے اجلاس میں نسلی امتیاز کے خاتمے کا عالمی معاهده پاس ہوا جو 1969ء میں نافذ عمل ہو گیا۔ اس کے نتیجے میں پہلک مقامات اور اداروں میں رانچ امتیازی سلوک ختم ہوا۔ یہ 1958ء اور 1960ء میں منظور کردہ عالمی معاهده (کونشن) سے زیادہ موثر تھا۔ قرارداد کے مطابق نسلی امتیازات کے خاتمے پر پیش رفت کو قانونی حیثیت حاصل تھی اور اُن کے فرائض میں پسمندہ گروپوں کو ایکشن پروگرام کے تحت وسائل کی فرائیں اور اُن کی ترقی ایجنڈے کا حصہ تھی۔

مزدوروں کے حقوق کی تحریک

بھاپ کے انجن کی ایجاد سے پہلے مشینی کم دستیاب اور خاصی مہنگی تھی جبکہ مزدوری

ستی اور اوقات کار سے عاری انسانی مشقت قابل قبول سمجھی جاتی تھی۔ انیسویں صدی تک مزدور سرمایہ داروں (مل مالکان) کے رحم و کرم پر تھے۔ یہ عموماً آقا اور غلام جیسا رشتہ ہوتا تھا۔ 1830ء میں فرانس میں مزدوروں کے سماجی انصاف کے حصول کے لئے سوچل جمٹس نامی تحریک شروع کی گئی جس کے ساتھ ہی مزدور یونین کی تشکیل اور مشقت کے اوقات مقرر کرنے کے لئے مظاہروں کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا۔ ٹریڈ یونین کی تشکیل پر عائد کردہ پابندی کو 1824ء میں برطانیہ اور 1884ء میں فرانس میں ختم کیا گیا تاہم امریکہ میں عدالتی کارروائی کے ذریعے 1930ء تک یونین کی سرگرمیوں کو دبایا گیا۔ مختلف ملکوں میں لیبر کے سرکاری مکے 1900ء کے آغاز میں قائم کیے گئے۔ فرانس میں مزدوروں کے حقوق سے متعلق پہلا قانون 1901ء میں منظور کیا گیا۔ اس لئے مشقت کے دورانیہ میں کمی کی مانگ کو سرمایہ داروں کی جانب سے شدید تقدیم کا نشانہ بنایا گیا۔ برطانیہ میں راجح لیبر قانون میں تبدیلی کر کے فیکٹریوں میں بچوں اور عورتوں کے لئے روزانہ 10 گھنٹے کام کا دورانیہ مقرر کیا گیا۔ امریکہ میں کچھ ریاستی قوانین 1840ء اور 1850ء کے دوران پاس کئے گئے مگر 1870ء تک ان پر عمل درآمد نہیں ہوا تھا۔ روزانہ 8 گھنٹے کام کے دورانیہ کا رواج 1850ء میں آسٹریلیا میں پڑا۔ امریکہ میں ایک عدالتی فیصلے کے نتیجے میں روزانہ 8 گھنٹے کام کا دورانیہ اور کیم میٹی کو مزدوروں کا دن منانے کی گنجائش پیدا ہو چکی تھی لیکن عملی طور پر اس کو پہلی علمی جنگ کے بعد نافذ کیا گیا جس میں روزانہ 8 گھنٹے کا دورانیہ اور ہفتے میں 6 دن کام کے لئے مقرر کیے گئے۔ یہ نعمت یورپ کے مزدور طبقہ کو ایک صبر آزماء جدوجہد کے بعد 1920ء میں نصیب ہوئی۔ ہفتے میں 40 گھنٹے کام کو 1936ء میں فرانس میں نافذ کیا گیا اور 1938ء کو امریکہ میں اس طریقہ کار کو متعارف کروایا گیا۔

ہندوستان میں منو کے کئی قوانین مزدور اور انتظامیہ کے باہمی تعلقات سے متعلق ہیں۔ لیکن مزدوروں کے حقوق پر قانون سازی اٹھا رہو ہیں اور انیسویں صدی کے صنعتی انقلاب کی مربوں منت ہے۔ روشن خیالی کی اس تہذیب میں جدید سماجی اور اخلاقی نشوونما کے ساتھ

ساتھ عالمی معیارات سے ہم آہنگ نئی قانون سازی کی گئی۔ پہلی مزدور دوست قانون سازی 1802ء میں برطانیہ میں ہوئی۔ 1848ء میں سوئٹر لینڈ نے بچوں کی مشقت پر پابندی سے متعلق قانون پاس کیا۔ بیماری کی انسورنس اور ہر جانے کو سب سے پہلے جرمی میں 1883-84ء میں تسلیم کیا گیا۔ پہلی عالمی جنگ کے بعد مزدوروں کے لئے قانون سازی میں تیسری آئی اور 1929ء میں امریکہ میں صنعتی مسائل نے ان کی منظوری میں مدد دی۔ روس میں ان کی قانون سازی 1917ء کے انقلاب کے ساتھ شروع ہوئی۔ جبکہ پہلا آئی ایل او لبر کونیشن 1919ء میں پاس کیا گیا۔

فرہنگ

پہلی عالمی جنگ	1914ء تا 1918ء
دوسری عالمی جنگ	1939ء تا 1945ء
سنکرتی ضابطہ	منو کے شاستر
جشنین ا	[بازطنی ریاست کے بادشاہ] 482ء تا 565ء
جشنین II	[بازطنی ریاست کے بادشاہ] 669ء تا 711ء
نوآبادیاتی نظام	17ویں صدی سے 20 صدی تک مختلف ممالک پر غیر ملکی تسلط تجارتی کمپنی جس کا پہلا چہاڑ سورت کی بندرگاہ پر 1608ء میں انگر انداز ہوا اور ہندوستان اور دیگر ممالک میں برطانوی راج کی راہ ہموار کی۔
قاہرہ اعلامیہ	نومبر 1943ء میں چین، امریکہ اور برطانیہ کی قیادت نے مصر کے دارالحکومت قاہرہ میں جاپان کی جاریت کو روکنے کے لئے پالیسی بنائی گئی اور کیم دہبر کو تیوں ممالک نے ایک اعلامیہ پر دستخط کئے۔
ڈاکٹر مارشل لوہر نگ	1929ء تا 1968ء سیاہ فام امریکیوں کے (مساوی) حقوق کا علمبردار

جدید تصور اور بین الاقوامی ادارے

حقوق بشر کی بحث تو اتنی ہی پرانی ہے جتنی انسانی تمدن اور معاشرت کی تاریخ، لیکن انسانی حقوق کے نئے تصورات اٹھا رہوں صدی میں سامنے آئے، پھر بیسویں صدی میں انسانی حقوق کے متعلق شعور میں نمایاں اضافہ ہوا۔ پہلی عالمی جنگ کے بعد (1919ء) پیرس میں کافرنس میں انسانی حقوق کی اہمیت کو لیگ آف نیشنز میں ایک معاملہ کی شکل میں تسلیم کر لیا گیا۔ جنگ کے بعد برطانیہ کے اتحادیوں اور دوسری طرف جرمی اور اس کے اتحادیوں کے درمیان امن کی یہ قرارداد دنیا کو کسی دوسری عالمی جنگ سے بچانے کی کوشش تھی۔ اس قرارداد میں بھی انسانی حقوق کا ذکر آیا۔ لیگ کے چارٹر میں نسلی اقلیتوں اور تمام مذاہب کی عزت و احترام کا نکتہ شامل تھا۔ چارٹر میں وضع کردہ تمام ذمہ داریوں اور پابندیوں پر عمل درآمد کو داخلی معاملہ سمجھنے کی بجائے عالمی سطح پر ان کی اہمیت کو تسلیم کیا گیا۔

تاہم چارٹر میں انسانی حقوق سے متعلق ایک کوتا ہی یہ ہوئی کہ امریکہ اور برطانیہ کے اعتراض پر لیگ آف نیشنز نے جاپان کی اس تجویز کو رد کر دیا کہ کسی مجرم ملک کو قومیت، نسل کی بنیاد پر اپنے قانون میں امتیازات برتنے کی رعایت دی جائے گی جس کی وجہ سے لیگ آف نیشنز فرد کے انفرادی اور بنیادی حقوق کو تسلیم نہ کرو اسکی اگرچہ چارٹر کی دیگر شرائیں تسلیم کی گئیں جیسے انسانی لبر کے متعلق واضح شرائط، نوآبادیاتی علاقے میں مقامی لوگوں کی فلاج اور خطرناک بیماریوں سے بچاؤ اور ان پر کنٹرول وغیرہ۔ انسانی حقوق کے علمبرداروں کی جانب سے پیش کردہ تحریک اور مختلف ممالک کے اتحاد سے لیگ آف نیشنز کے طفیل یہ امید پیدا ہوئی کہ علاقائی جھگڑے اور مختلف ممالک کے درمیان تنازعات بین الاقوامی قانون کی روشنی میں پُر امن طریقے سے حل کئے جاسکتے ہیں۔ ان مقاصد کے حصول کے لئے عالمی انصاف کی عدالت کا قیام ناگزیر تھا۔

امریکی صدر رود روولسن کا پہلی عالمی جنگ کے بعد امن کے معاهدہ کی تیاری میں کلیدی کردار تھا جس میں لیگ آف نیشنز کے قیام کی سفارش کی گئی لیکن امریکی کانگریس اس کی قرارداد پر دستخط اور تویش میں ناکام رہی۔ البتہ دنیا میں انسانی حقوق کے اطلاق اور عالمگیر امن قائم کرنے کی سوچ کو پذیرائی ملی۔ قرارداد کا ابتدائی خاکہ برطانیہ، فرانس اور اٹلی کی خواہشات کے مطابق جرمنی سے بدلہ لینے پر مرکوز تھا۔ جرمنی کو جنگ کی ذمہ داری قبول کرنا پڑی۔ اس نے مقبوضہ علاقے واپس کیے اور جنگی تباون بھی ادا کیا۔ لیگ کی ناکامی کی بنیادی وجہ ممالک (جرمنی، اٹلی اور جاپان) کی طرف سے علاقائی توسعی پسندی کے سامنے بے اثر ہونا تھا۔ لہذا 1939ء میں دوسری عالمی جنگ کے ساتھ لیگ آف نیشنز کا وجود تحلیل ہو گیا۔ پھر اسے 1945ء میں اقوام متحده کی شکل میں دوبارہ زندہ کیا گیا جس میں لیگ کے لئے وضع کردہ طریقہ کار اور قواعد و ضوابط اور ناکامیوں سے استفادہ کیا گیا۔ 1919ء میں لیبر کے شعبہ میں انسانی حقوق کے قوانین و ضوابط کی تنظیم کا آغاز آئی ایل او کے قیام کے ذریعے ہوا جو آج تک قائم ہے۔ ان قوانین کا خاطر خواہ فائدہ بھی ہوا۔ یوں لگتا ہے آئی ایل او کا آئین و رسائی معاهدہ کے پوائنٹ تیرہ سے اخذ کیا گیا تھا۔ آئی ایل او خود مختار اور دیگر بین الاقوامی تنظیموں سے مختلف تھی کیونکہ آئی ایل او میں مختلف حکومتوں کے علاوہ لیبر اور صنعت کاروں کی نمائندگی بھی لی گئی تھی۔

آئی ایل او اقوام متحده کے نظام کی سب سے پرانی تنظیم ہے جس میں قیام کے بعد معمولی تبدیلیوں کی ضرورت پیش آئی۔ اس تنظیم کے طفیل مزدوروں کے حقوق کے عالمی معیارات قائم ہوئے اور مختلف ممالک میں لیبر کے قوانین میں بہتری واقع ہوئی۔ اس کے مقاصد میں لیبر قوانین اور آجر اور اجیر کے باہمی تعلقات بہتر بنانے کے علاوہ جری مشقت پر پابندی، روزگار اور ملازمتوں کی فراہمی میں امتیازات کے خاتمے کے علاوہ تریڈ یونین کے قیام اور یکسان معاوضہ کا اطلاق شامل تھا۔ آئی ایل او معاهدات اور سفارشات کے ذریعے درج بالا مقاصد کے حصول کے لئے کام کرتی ہے۔ معاهدات کے ذریعے ممبر ممالک پر کچھ ذمہ داریاں عائد کی جاتی ہیں جبکہ سفارشات کے ذریعے مزدور دوست قانون سازی کی ترغیب دی جاتی ہے۔ آئی

ایل او کا ایک معابدہ قدیم مقامی باشندوں کے حقوق سے متعلق ہے۔ ہر تین سال کے بعد آئی ایل او کے نمبر ممالک اپنی روپرٹس پیش کرتے ہیں۔ جن کی جانب پڑتال ماہرین کی کمیٹی کرتی اور پھر اعترافات و سوالات اٹھاتی ہے۔ کسی بھی ملک کے محنت کشوں کے حقوق کی غمین خلاف ورزی کی صورت میں متعلقہ جگہوں پر انکوارری کمیشن بھیجا جاسکتا ہے۔

اقوام متحده کا قیام

دوسری عالمی جنگ کے بعد انسانی حقوق کے مطالعے اور اس کے متعلق قانون سازی میں تیزی آئی۔ جنگ کے دوران ہی 1941ء میں فرینٹنکلن ڈی روز اولیٹ اور نوٹن چرچل نے ایک چارٹر (Atlantic Charter 1941) تحریر کیا جس میں عوام کا اپنے لئے طرز حکومت کے انتخاب کا حق تسلیم کیا گیا تھا۔ کیم جنوری 1942ء کو اتحادی قوتوں نے اقوام متحده کے اعلامیہ پر دستخط کئے۔ جو اٹلانٹک چارٹر کا سلسلہ تھا اگرچہ چارٹر جنگی مقاصد کے حوالے سے تھا لیکن اس میں انسانی حقوق اور انصاف کے قیام کو اتحادیوں کے لئے امن کے مقاصد قرار دیا گیا۔ یوں پہلے پہل اقوام متحدة کی اصطلاح ان اتحادی ممالک کے لئے استعمال کی گئی جو جرمنی، اٹلی اور جاپان کے خلاف اکٹھے ہوئے تھے۔

واشنگٹن ڈی سی میں اگست اور اکتوبر 1944ء میں اجلاس کے دوران یہ تجویز پیش کی گئی کہ دنیا کی طاقت ور اقوام کی انجمن اقوام متحدة بنائی جائے۔ یہ تجویز آئندہ سان فرانسکو میں ہونے والے اجلاس کی بنیاد بن گئی جہاں 26 جون 1945ء کو اقوام متحده کا چارٹر پاس کیا گیا۔

سان فرانسکو میں 50 اقوام کی کانفرنس میں اس چارٹر پر دستخط ہوئے جو 24 اکتوبر 1945ء کو نافذ عمل ہوا۔ اس چارٹر میں انسانی حقوق اور بنیادی آزادیوں کا متعدد بار ذکر آیا۔ اس چارٹر میں اعلان کیا گیا کہ تمام اقوام اقتدار اعلیٰ کی مالک اور برابر کی خود مختار ہیں اور تمام تباہیات کا پُران طریقے سے حل تلاش کیا جائے گا۔ چارٹر میں اعادہ کیا گیا کہ بنیادی انسانی حقوق میں انسان (مرد و زن) وقار و کردار کے حامل، برابر کے حقوق اور ہر قوم خواہ وہ

چھوٹی ہو یا بڑی عزت و احترام کے لائق ہے۔ چارٹر میں ممبر ممالک پر یہ ذمہ داری عائد کی گئی کہ ممالک انسانی حقوق کی سر بلندی اور احترام کو یقینی بنانے اور آزادی کے لئے بلا امتیاز، رنگ، نسل، جنس اور زبان کے کاوشیں کریں گے۔ کانفرنس میں پیش کی جانے والی تجویزیں میں ایک تجویز یہ بھی تھی کہ اقوام متحده نہ صرف انسانی حقوق کے فروع کے لئے اقدامات کرے بلکہ ان کے تحفظ کو بھی یقینی بنائے۔ البتہ اس خیال کو مناسب پذیرائی نہیں ملی۔ اقوام متحده کے چارٹر میں بارہا ذکر آیا کہ کسی ملک کے اندر ورنی معاملات میں مداخلت نہ کی جائے۔ تاریخ میں انسانیت کے ناطے دوسرے ممالک کے داخلی معاملات میں مداخلت کی کئی مثالیں موجود تھیں۔ اس لئے ممالک کے اس سلسلے میں تب بھی ابھے خاصے تحفظات تھے۔ (1827ء میں برطانیہ، فرانس اور روس نے یونانی آبادی کے تحفظ کے لئے ترکی کے خلاف جنگ کی اور بالآخر 1830ء میں یونان آزاد ہوا)۔ اقوام متحده میں اس چارٹر پر اختلاف بھی ہوا کئی ممبران نے کہا کہ چارٹر کی پاسداری لازم نہیں ہونی چاہیے جبکہ دوسروں کی رائے تھی کہ چارٹر کی شقوں کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔



نیو یارک (امریکہ) میں واقع اقوام متحده کی جزوی اسمبلی کی عمارت

اس تنازع کو عملی طور پر حل کیا گیا۔ ووٹ کے ذریعے کچھ معاملات میں اقوام متحده کی دوسرے ممالک میں مداخلت پر رائے شماری بھی ہوئی۔ مثلاً جنوبی افریقہ میں نسلی امتیاز، برماء اور مشرقی یورپ میں جبری مشقت کا معاملہ اور ویت نام میں بدھ مت کے خلاف امتیاز وغیرہ۔ تاہم چارٹر میں بیان کردہ اصول پہلی مرتبہ عالمی قانون کا حصہ بن گئے۔

اقوام متحده کے اہم ادارے

ابتداً چند دہائیوں میں اقوام متحده کے مندرجہ ذیل اداروں نے انسانی حقوق کے تصورات اور معیارات تشكیل دینے میں نمایاں کردار ادا کیا۔

- جزل اسمبلی
 - سماجی اور اقتصادی کونسل
 - کمیشن برائے انسانی حقوق
 - امتیازات کے خاتمے اور اقلیتوں کے تحفظ کے لئے ذیلی کمیشن
 - عورتوں کے مقام کا کمیشن
 - سلامتی کونسل
 - جرام کی روک تھام اور فوجداری انصاف کا کمیشن
- سلامتی کونسل پانچ مستقل نمائندوں پر مشتمل ہے جن کو ویٹو کا اختیار حاصل ہے اور دس دیگر اراکین ہیں جن کا انتخاب جزل اسمبلی کرتی ہے۔ تمام ممبرز کو ووٹ کاست کرنے کا حق حاصل ہے۔ اقوام متحده کے چارڑی میں آرٹیکل نمبر 29 میں واضح طور پر بیان کیا گیا ہے کہ عالمی امن اور سلامتی کو برقرار رکھنا سیکورٹی کونسل کی ذمہ داری ہے۔ اگرچہ بعض موقعوں پر اس کے ممبران نے اس کے فیضوں کو تعلیم نہیں کیا مثلاً کوریا کی جنگ (1950 تا 1953ء) اور سہر سویز (1956ء) کا بحران اور (2003ء) میں عراق میں جنگ کا فیصلہ سلامتی کونسل کی اجازت کے بغیر ہوا۔

جزل اسمبلی سماجی اور اقتصادی کونسل کے لیے 54 حکومتی نمائندوں کا بھی انتخاب کرتی ہے جو 2005ء تک انسانی حقوق کمیشن کی طرف سے پیش کی جانے والی سفارشات کو منظور کرتی تھی۔ کمیشن برائے انسانی حقوق کے 53 حکومتی ممبران کو تین سال کے لیے منتخب کیا جاتا تھا۔ یہ کمیشن دنیا بھر میں انسانی حقوق کی صورتِ حال اور حقوق کی پامالیوں کا جائزہ لیتا اور پروگراموں اور پالیسیوں کے اجراء کی سفارشات پیش کرتا تھا جبکہ اس کے ذیلی کمیشن کے ذمہ امتیازات کے تدارک اور اقلیتوں کے تحفظ کے لیے عملی اقدامات کرنا تھا۔

جزل اسمبلی کی کچھ قرارداد یہ بظاہر میں الاقوامی قانون کا درجہ رکھتی ہیں لیکن اس کی پاسداری کرنا یا نہ کرنا یہ ممکن کا اختیار ہے۔

(مزید تفصیلات باب اقوام متحده میں اصلاحات میں ملا خلط کریں)

انصاف کی عالیٰ عدالت نیدر لینڈز کے شہر پیگ میں واقع ہے۔ تمام ممالک اس عدالت کے پندرہ جھوٹ کی تقریب کے لیے الگ الگ ووٹ کا سٹ کرتے ہیں۔ یہ دوسری عالیٰ جنگ کے بعد مستقل ادارہ بن گئی ہے۔ اس عدالت کا بنیادی کام مختلف ممالک کے درمیان تنازعات کو نہانہ اور معاملہات کی تشریح کرنا ہے۔ سادہ لفظوں میں اس کو اقوام متحده کی دیوانی عدالت کہا جاسکتا ہے۔

اس کا پہلا سیشن 1946ء میں منعقد ہوا۔ اس کے فیصلے ان ریاستوں کو عمل درآمد کا پابند بناتے ہیں جو اس کے عدالتی اختیار کو رضا کارانہ تسلیم کرتے ہیں۔ 1998ء میں ایک معاملہ کے ذریعے ایک بین الاقوامی فوجداری عدالت کا قیام عمل میں آیا۔ جس کی توثیق 2002ء میں کی گئی۔ اس کے دائرة اختیار میں نشایت کے جرائم، دہشت گردی، نسل شنی، جنگی جرائم اور انسانیت کے خلاف جرائم شامل ہیں۔ پاکستان اور امریکہ سمیت کئی ممالک نے اس کی توثیق نہیں کی لیکن اس انتہائی شاندار اقدام کو قانونی حیثیت حاصل ہو چکی ہے اور فوجداری عدالت نے کام شروع کر دیا ہے۔

بین الاقوامی معاملہوں یا قوانین کے تحت غیر جانبدار ماہرین پر مشتمل کمیٹیاں قائم کی گئی ہیں جو انسانی حقوق پر عملدرآمد کروانے کے نظام کا حصہ ہیں۔ اٹھارہ ارکان پر مشتمل انسانی حقوق کی کمیٹی 1977ء سے قائم ہے۔ جس کا کام معاملہ کے تحت ممبر ممالک میں شہری اور سیاسی حقوق کی پاسداری کا جائزہ لینا ہے۔ اس کا اجلاس جنیوا اور نیویارک میں ہوتا ہے۔ اقتصادی، معاشری اور ثقافتی حقوق کے حوالے سے قائم شدہ اٹھارہ رکنی کمیٹی بھی ان حقوق کے تحفظ کے لیے کام کرتی ہے۔ نسلی امتیاز کے خاتمے کی کمیٹی بھی اٹھارہ افراد پر مشتمل ہے جو اپنے اغراض و مقاصد کے تحت اپنی سرگرمیاں سرانجام دیتی ہے۔ یہ کمیٹی اگر مذاکرات کے ذریعے مختلف قوموں کے درمیان تنازعات کو ختم کروانے میں ناکام رہے تو یہ انصاف کی عالیٰ عدالت میں ایسے کیس ریفر کر سکتی ہے۔ اقوام متحده گاہ ہے بگاہے جزل اسٹبلی کی قراردادوں اور اعلامیوں کے ذریعے انسانی حقوق پر توجہ دلانے کی سعی جاری رکھتی ہے۔ ممبر ممالک ان

قراردادوں کے اس طرح تو پابند نہیں ہوتے جیسے کسی معاملہ کے لیکن یہ اخلاقی دباؤ کے ذریعے اقوام کو ان کی ذمہ داریاں یاد دلانے کا ذریعہ ہیں۔ اختصار یہ ہے میں الاقوامی ادارے قوموں کے درمیان ایک دوسرے سے اچھا برتاؤ، صحبوت اور صلح و تفہیم کو فروغ دیتے ہیں۔ اقوام متحده کے 16 خصوصی ادارے ہیں جن میں مندرجہ ذیل زیادہ مشہور ہیں۔

بین الاقوامی ادارہ محنت	(آئی ایل او)
اقوام متحده کا ہائی کمشن برائے مہاجرین	(یوائین ایچ سی آر)
اقوام متحده کی تعلیمی اور سماجی کمیٹی	(یونیسکو)
خوارک وزراعت آرگناائزیشن	(ایف او اے)
ورلڈ بنک	(ڈبلیو بی)
عالمی مالیاتی فنڈ	(آئی ایم ایف)
عالمی ادارہ صحت	(ڈبلیو ایچ او)
اقوام متحده کا بچوں کا تعلیمی فنڈ	(یونیسیف)
یہ تمام ادارے اپنی سالانہ روپورٹس اقتصادی اور سماجی کو نسل کو پیش کرتے ہیں۔	

انسانی حقوق کا کمیشن اور انسانی حقوق کا عالمگیر اعلامیہ



ایلینور اور فرننکلن روز اولیٹ (امریکی صدر)

واضح اہمیت کے پیش نظر انسانی حقوق کے کمیشن کی تشكیل اقوام متحده کے چارٹر کا حصہ تھی۔ اقوام متحده کی تنظیم کے قیام میں امریکہ کے صدر فرننکلن روزویلٹ اور ان کی اہلیہ کی محنت سرفہرست

تحقی۔ لہذا صدر کی وفات کے بعد ان کی بیوہ ایلینور روز اویلٹ کو (1945ء تا 1952ء) کمیشن کا سربراہ مقرر کیا گیا۔ 1946ء سے اس کمیشن کو اکنامک اینڈ سوشل کونسل کے تحت رکھا گیا۔

بین الاقوامی حقوق کے بل (انٹرنیشنل بل آف ہیمن رائٹس) کا مسودہ تیار کرنا اس کی پہلی ذمہ داری تھی۔ اس منصوبے کے مطابق ایک جامع معابرہ اور اطلاق کے اقدامات، پر مسودہ تیار کیا جانا تھا۔ سب سے پہلے انسانی حقوق کے عالمگیر اعلامیہ (یو ڈی ایچ آر) کے مسودے پر کام کیا گیا جو کہ 10 دسمبر 1948ء کو اقوام متحده کی جزوی اسمبلی کے ذریعے منظور ہوا کسی ملک نے مخالفت میں ووٹ نہیں ڈالا البتہ سوویت بلاک، سعودی عرب اور جنوبی افریقہ نے ووٹنگ میں حصہ نہیں لیا۔ اقوام متحده کی جزوی اسمبلی نے مسز روز اویلٹ کو اس مشن کو خوش اسلوبی سے انجام دینے پر خراج تحسین پیش کیا۔ کیونکہ یو ڈی ایچ آر میں انسانی حقوق کی مشترکہ اقدار اور معیارات پر عالمی اتفاق رائے کروانا کوئی آسان نہ تھا۔ اس پر بحث کئی اجلاس اور 28 ماہ پر محيط تھی۔ 1950ء میں یورپین کونپیشن آف ہیمن رائٹس پاس ہوا اور یورپ کی سطح پر انسانی حقوق کی ایک عدالت وجود میں آگئی لیکن مختلف نظریات اور مفادات کی وجہ سے اقوام متحده کے ممبر ممالک انسانی حقوق کے عالمگیر اعلامیہ کی اطلاقی بنیادوں کو مضبوط کرنے میں ناکام رہے۔ رکن ممالک جاری جنگ سے بیزار تھے اور عالمی امن کے لیے ایک ادارہ بنانے کے لیے ایسے ملن تھے کہ یو ڈی ایچ آر پاس ہونے کے بعد انسانی حقوق پر مناسب توجہ دلانے میں کم و بیش پندرہ سال لگ گئے۔ انسانی حقوق کا یہ اعلامیہ تو پاس ہو گیا لیکن ملکوں کی جانب سے ان پر سنجیدہ غور و فکر کے لیے سالوں کی جدوجہد ابھی درکار تھی۔ اعلامیہ کی مسودہ کمیٹی کے ابتدائی اراکین میں سے ایک رکن نے یو ڈی ایچ آر پاس ہونے پر یہ تبصرہ کیا تھا۔ ”ہم متفقہ طور پر ان حقوق کو تسلیم کرتے ہیں بشرطیکہ کوئی ہم سے یہ نہ پوچھے کہ کیوں؟“

اعلامیہ اہم روایجی، سیاسی اور شہری حقوق کے ساتھ ساتھ اقتصادی، سماجی اور ثقافتی حقوق کا خلاصہ تھا۔ انسانی حقوق کا عالمگیر اعلامیہ انسانی ترقی میں سگیں میل ثابت ہوا۔ ابتداء میں اس کو محض راہنمہ اصولوں کی ایک دستاویز سمجھا گیا کیونکہ اس کی طاقت اخلاقی دباؤ تک

محروم تھی اور اس کے نفاذ کا نظام تکمیل نہیں پایا تھا۔ انسانی حقوق کے عالمگیر اعلامیہ کی منظوری کے بعد مسز ایلینو روز اولیٹ دوسال کے عرصے تک اس پر ایک معاملہ کی تکمیل کے لیے کام کرتی رہیں تاکہ تمام ممالک مشترک طور پر اس اعلامیہ کے نفاذ کے لیے کام کریں اس کوشش کو تب کوئی خاطرخواہ کامیاب نصیب نہیں ہوئی مگر اعلامیہ کی قانونی حیثیت اور تفہیم کا ارتقا بذریعہ ہوتا رہا۔ 1989ء میں جان ہمفرے جو اعلامیہ کو ڈرافٹ کرنے میں شامل تھا، نے کہا کہ ”اعلامیہ کا اطلاق ان ریاستوں پر بھی ہو گا جنہوں نے 1948ء میں اس کے حق میں ووٹ نہیں دیا تھا۔“ انسانی حقوق کے عالمگیر اعلامیہ کے دیباچے کا پہلا فقرہ انسانی حقوق کا تعلق دیگر امور سے جوڑتا ہے۔ آج بلاشبہ انسانوں کے پیدائشی وقار اور نسل انسانی میں یکساں اور ناقابل انتقال حقوق کا تسلیم کیا جانا دنیا میں آزادی اور امن و انصاف کے امکان کی بنیاد ہے۔

انسانی حقوق کی اولیت کا اقرار اس فکر کا پہلا زینہ ہے۔ انسانی وقار انسانی حقوق کے ایسے معیار کا تقاضا کرتا ہے جو کہ ایک آسودہ انسانی زندگی گزارنے کے لیے ضروری ہے۔ انسانی وقار سے آگاہی حاصل کرنا سب سے مقدم ہے اور تمام حقوق اور ذمہ داریاں عالمگیر اور ناقابل تردید ہیں اور ان چیزوں تک رسائی انسان کا پیدائشی حق ہے جن سے زندگی انسان کے شایان شان بنتی ہے۔ انسانی حقوق کے اعلامیہ کے دیباچے کے پہلے فقرے میں بتایا گیا ہے کہ انسانی حقوق کی پاسداری کے لیے امن قائم کرنا بنیادی شرط ہے۔ آزادی انسانی حقوق کا بنیادی عنصر ہے اسی لیے رواتی طور پر سیاسی اور شہری حقوق کو حقوق کی پہلی فصل کہا جاتا ہے۔

انسانی حقوق کے عالمگیر اعلامیہ میں حقوق کا ذکر 51 مرتبہ آیا ہے۔ جبکہ فرائض کو آرٹیکل 29 میں ایک بار بیان کیا گیا ہے۔ وہ بھی انفرادی نہیں بلکہ سماجی ذمہ داری کے حوالے سے۔ انسان جس معاشرہ میں رہتا ہے اس معاشرہ سے متعلق اس کے کئی فرائض ہیں کیونکہ فرد کی آزادانہ اور مکمل نشوونما اس معاشرے کے اندر ممکن ہے۔ بعد ازاں یہ رائے پیش کی گئی کہ انسانی حقوق کے چاروں کے ساتھ ایک ضمیمہ انسانی فرائض کا بھی بنایا جائے۔ دولت مشترکہ کے کئی رکن ممالک کے دستیں میں فرائض کا ذکر بنیادی سماجی ذمہ داریوں کے طور پر آیا ہے۔

یوڈی ایچ آر کے پہلے تین آریکلز اعلامیہ کا بنیادی فلسفہ بیان کرتے ہیں کہ سب انسان پیدائشی طور پر آزاد، وقار و حقوق کے اعتبار سے برابر پیدا ہوتے ہیں۔ لہذا انسانوں میں نسل، رنگ، جنس، زبان، مذہب، سیاسی، قومی اور سماجی رتبے یا علاقے، جائیداد کی بنا پر کوئی امتیاز نہیں ہونا چاہیے۔ ہر شخص کی آزادی کے ساتھ جان و مال کی حفاظت اور دوسرے حقوق کا تحفظ بھی بہت ضروری ہے۔

آریکل 4 اور 21 شہری اور سیاسی حقوق، آزادی اور جائیداد وغیرہ کے حقوق بیان کرتے ہیں۔ آریکل 22 سے 30 اقتصادی، سماجی اور ثقافتی حقوق سے متعلق ہیں جو انسانی وقار، اس کی آزادی اور فلاج و بہبود کے لیے انتہائی ضروری ہیں۔ اعلامیہ میں حقوق کو کسی مخصوص گروہ مثلاً قلیلتیں، خواتین، قبیلے کی بجائے انفرادی حیثیت میں بیان کیا گیا ہے۔ منحصر یہ کہ اعلامیہ انفرادی طور پر ہر انسان کے لیے خوف اور غربت سے آزادی کا اعلان اور مطالبہ کرتا ہے۔ یہ حقوق مختلف ممالک کے آئین میں تسلیم ہونے پر بنیادی حقوق کہلانے 1950ء میں بھارت نے اعلامیہ سے ماخوذ ملکی آئین میں حقوق کا بل تشکیل دیا۔ بلکہ دلیش کے آئین میں اگرچہ حقوق کا بل موجود نہیں تھا لیکن 1972ء میں بلکہ دلیش نے اپنے آئین میں اعلامیہ کے بعض آریکلز کو شامل کیا۔ پاکستان کے آئین (1973ء) میں دوسرے اباب مختلف بنیادی حقوق کا احاطہ کرتا ہے۔

بنیادی حقوق کے تحفظ میں آزادی ترجیحی شرط ہے۔ جس کے بعد بدترین ذریعہ معاش، انسانی جان و مال کی ذمہ داری اور دوسرے بنیادی حقوق شامل ہیں۔

کسی معاشرہ میں حقوق کی صفائح کے باوجود کوئی شخص تک ان حقوق سے بہرہ مند نہیں ہو سکتا جب تک اسے ایک صحت مند اور متحرک زندگی کی بنیادی شرائط یا لوازمات مہیا نہیں کیے جاتے۔ امریکہ نے کوشش کی کہ سیاسی اور شہری حقوق کو سماجی اور ثقافتی حقوق سے الگ کیا جائے اور ان کو کم تر حیثیت دی جائے اور اس کے علاوہ اقتصادی، سماجی اور ثقافتی حقوق کے معاملہ کی توثیق نہیں کی۔ امریکہ کو خوف یہ تھا کہ معاملے اور اعلامیہ کے ناطے میں دیگر ملکوں کے ساتھ اسے بھی مجبور کیا جائے گا کہ وہ فلاجی امور اور سوشل سیکورٹی پر اخراجات

بڑھائے جکہ حقیقت یہ ہے کہ ریاستیں بدنرنگ سماجی، اقتصادی اور شفافی حقوق کے لیے عملی اقدامات پر غور کر رہی تھیں تو ان حالات میں ترقی کے ایک بنیادی حق کو تنقیم کرنا نہایت ضروری تھا کہ نسل، رنگ، جنس، زبان، مذہب سیاسی یا دوسرے مقاصد ملکی، سماجی اور علاقائی، جانیداد اور جائے پیدائش کے حوالے سے امتیازات پر پابندی عائد کی جائے۔

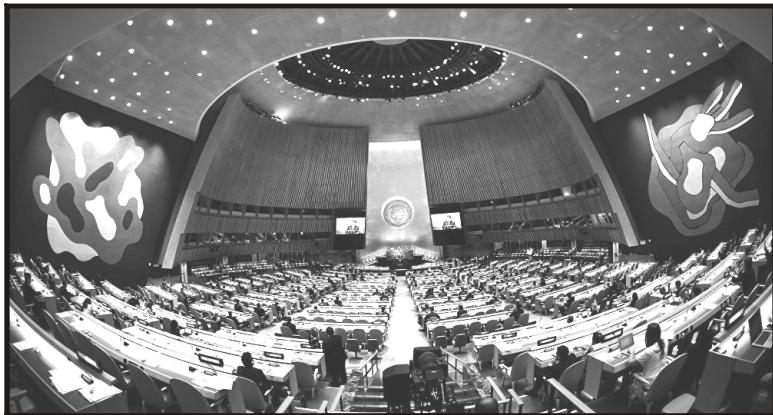
جزل اسمبلی نے 1966ء میں انسانی حقوق کا بین الاقوامی بل منظور کیا جس میں انسانی حقوق کا عالمگیر اعلامیہ (یوڈی ایچ آر) کے علاوہ معاشری، سماجی و شفافی حقوق کا معاهده (آئی سی ای ایسی آر) اور شہری و سیاسی حقوق کا معاهده (آئی سی پی آر) بھی شامل ہیں اور اس کی توسعہ کا اعلامیہ جس کو اکثر ممالک نے منظور نہیں کیا اور اس کے ساتھ اقتصادی، سماجی اور شفافی حقوق کے بین الاقوامی معاهدہ کی توثیق 23 مارچ 1976ء کو کردی گئی۔ شہری اور سیاسی حقوق کے معاهدے میں فرد کو اہمیت دی گئی تھی۔ جکہ اقتصادی، سماجی اور شفافی حقوق سماجی پس منظر پر ہوتی تھے۔ یہ دو معاهدے جامعیت کے اعتبار سے یوڈی ایچ آر کے اعلامیہ سے زیادہ اہم تصور کیے جاتے ہیں کیونکہ یوڈی ایچ آر میں قانونی نفاذ کی بجائے صرف اخلاقی اصول وضع کیے گئے ہیں۔ معاهدہ کی پاسداری ان ممالک کے لیے لازم قرار دی گئی جو کہ اس پر دستخط اور توثیق کرتے ہیں۔ جزل اسمبلی سے منظوری کے لیے معاهدات اس وقت پیش ہوتے ہیں جب کم از کم پنیتیس ممالک اس کو منظور کر دیں۔ پھر یہ معاهدہ ملکوں کو دستخط کے لیے پیش کیا جاتا ہے۔

سیاسی اور شہری حقوق کے معاهدے میں ذاتی جانیداد اور پناہ گزینوں کے حقوق شامل نہیں تھے جو کہ یوڈی ایچ آر کے اعلامیہ میں شامل تھے لیکن ان میں نئے حقوق شامل تھے مثلاً آزاد مرضی سے اپنی زندگی کے راستے کا تعین، اقلیتوں کو شفافی سرگرمیوں اور دیگر شعبہ ہائے زندگی میں پوری آزادی کا ذکر تھا۔ معاهدہ میں انسانی حقوق کی کمیٹی کے اٹھارہ افراد کی مدد لی گئی جو کہ انفرادی حیثیت میں منتخب کیے گئے تھے۔ کمیٹی ممالک کی ارسال کرده روپورٹس اور آپشنل پروٹوکول کے اطلاق کا بغور مطالعہ اور انفرادی طور پر معلومات حاصل کرتی ہے اور حکومتوں کو ان کی اہمیت سے روشناس کرواتی ہے۔

1993ء میں اقوام متحده کے زیر انتظام انسانی حقوق کی عالمی کانفرنس ویانا میں منعقد ہوئی جس میں عالمی انسانی حقوق کے معاملے کو اٹھایا گیا۔ چند ممالک بشمول چین، بھارت اور پاکستان نے یہ موقف اختیار کیا کہ ہر ملک کو اختیار دیا جائے کہ انسانی حقوق کی تعبیر و اطلاق کو مقامی ثقافت کے مطابق کر سکے۔ لیکن ثقافتی اضافت کے اس نظریہ سے انسانی حقوق کی عالمگیر حیثیت کم ہوتی تھی۔ دوسرا موقف ترقیاتی حقوق یا معاشری حقوق کو باقی حقوق پر ترجیح دینے سے متعلق تھا۔ انسانی حقوق کی نئی تعبیر کی دونوں کوششیں ناکام ہوئیں کیونکہ حقوق کی مساوات و آفیت سے انکار اور انحراف کسی بھی وقت حقوق سلب ہونے کا سبب بن سکتا ہے۔

فرہنگ

بیگ آف نیشنز Bigs Of Nations	(انجمن اقوام) (1919ء تا 1939ء)
بین الاقوامی عدالت انصاف International Court of Justice	Woodrow Wilson (امریکی صدر اور مفکر) (1856ء تا 1924ء)
وڈ روولسن Woodrow Wilson	فرینکلن ڈی روز ولیٹ Franklin D Roosevelt (1858ء تا 1945ء)
ویسٹرن Western	امریکی صدر (دوبار) اور شریک بانی اقوام متحده Winston Churchill برطانوی وزیر اعظم (1874ء تا 1965ء)
ویسٹرن چرلٹ Western Charter	(Atlantic Charter of August 14, 1941)
اٹلانٹک چارٹر Atlantic Charter	امریکہ اور برطانیہ کے درمیان قومی حقوق کا معاهده 14 دیس سے 20 دیس کے دوران ترک سلطنت
خلافت عثمانیہ Ottoman Empire	کوریا کی جنگ Korea War (1950ء تا 1953ء)
کوریا کی جنگ Korea War	نہر سویز بحران Nile River Crisis (1956ء تا 1957ء)
نہر سویز بحران Nile River Crisis	بین الاقوامی حقوق کے بل ICESCR / ICCPR (1966ء تا 1966ء)
بین الاقوامی حقوق کے بل International Bill of Human Rights	یوڈی ایچ آر UDHR (10 دسمبر 1948ء)، انسانی حقوق کا عالمگیر اعلامیہ
یوڈی ایچ آر UDHR	آپشنل پروٹوکول Optional Protocol (23 مارچ 1976ء)
آپشنل پروٹوکول Optional Protocol	معاهدہ ورسائی Treaty of Versailles (1919ء)
معاهدہ ورسائی Treaty of Versailles	الگ ثقافت کی بنیاد پر مانگی یادی جانے والی رعایت۔
الگ ثقافت Cultural Pluralism	



نيويارک (امریکہ): اقوام عالم کا پلیٹ فارم۔ اقوام متحده جنرل اسمبلی



جنیوا (سوئیزر لینڈ): اقوام متحده ہیڈمن رائٹس کنسل

اقوام متحده کے نظام میں اصلاحات

ویسے تو اکثر سربراہ مملکت بالعموم سال کے پہلے اجلاس میں اقوام متحده جا کر جزء اسمبلی کے اجلاس سے خطاب کرتے ہیں، لیکن ستمبر 2005ء میں سربراہ مملکت کی تعداد معمول سے زیاد تھی کیونکہ اقوام متحده کے نظام میں تبدلیوں پر ایک مسودہ زیر بحث تھا۔ گزٹینہ سالوں میں اقوام متحده پر ہونے والے اعتراضات اور سفارشات کو سامنے رکھ کر 20 مارچ 2005ء کو سیکرٹری جزء جانب کوئی عنان نے اقوام متحده کے سامنے اصلاحات کا ایک خاکہ پیش کیا تھا۔ ان اصلاحات کے مقاصد کچھ یوں بیان کیے گئے۔

- دنیا میں امن کے قیام اور سیکورٹی کے انتظام کو بہتر بنانا اور بوقت ضرورت قوت کے استعمال کا نظام وضع کرنا۔
- دنیا میں فروغ جمہوریت، انسانی حقوق پر عمل درآمد کے لیے ٹھوس اقدام کے لیے ادارے اور طریقہ کار بنانا نیز دنیا سے غربت کے خاتمے کے لیے علمی اقدامات کرنا۔ سیکرٹری جزء نے جو تجویز پیش کیں ان کا گوشوارہ یوں بتتا ہے۔

مقاصد	اقدامات
1- عالمی امن اور تحفظ کے لیے اقدامات (سلامتی کوسل میں شراکت بڑھانا، دہشت گردی وغیرہ سے نہیں)	سلامتی کوسل کی رکنیت میں توسع۔ ویٹو کے بغیر مستقل اور منتخب ارکان کی تعداد میں اضافہ۔ بدانی کی صورت میں اقوام متحده کی مداخلت کے لیے کوسل کے اختیارات میں توسع

انسانی حقوق کمیشن کی جگہ ایک کونسل کی تشییل جس کے ارکان کی تعداد (25) محدود ہو اور اس کا اجلاس سال میں کئی بار ہو سکے۔ ارکان کا انتخاب انسانی حقوق کے ضمن میں کارکردگی کی بنیاد پر جزل اسمبلی میں دو تہائی اکثریت سے ہو۔ ہائی کمشنر برائے انسانی حقوق کے دائرہ کا رکم اور وسیع کیا جائے۔	2- انسانی حقوق کا موثر نفاذ (عمل درآمد اور جواب دہی ممکن بنانا)
فروغ جمہوریت کے لیے اقوام متحده کا فنڈ اور ادارہ کا قیام	3- فروغ جمہوریت
غیر ممالک کے قرضے معاف کرنے کے لیے لاحچ عمل اور ترقیاتی امداد کی فراہمی	4- غربت کا خاتمه

سیکرٹری جزل نے اپریل 2005ء میں ان تجویزیں کیں جنیوا میں کمیشن برائے انسانی حقوق کے اجلاس میں دھرایا تو دنیا بھر میں ان پر بحث ہونے لگی۔ ادھر حکومتوں نے مخصوص مقاصد اور علاقائی سیاست کے پیش نظر گروپ بنندی شروع کر دی۔ برازیل، بھارت، جمنی اور جاپان نے سلامتی کونسل میں مستقل رکنیت کے لیے اپنے آپ کو امیدوار کے طور پر پیش کر دیا اور اس کے لیے رائے عامہ ہموار کرنا شروع کر دی۔

ویٹو اختیارات کے حامل روس، فرانس اور برطانیہ کی حمایت کے ساتھ بھارت کا مستقل رکن بننا تقریباً یقینی ہو گیا تھا کیونکہ امریکا اور چین کم از کم اس کی مخالفت نہیں کرتے۔ برازیل اور جاپان کو بھی ایک وسیع حمایت حاصل تھی۔ یہ الگ بات کہ ان دو ممالک کو امریکہ کی کھلے عام تائید نہیں ملی البتہ جمنی کو امریکہ اور اٹلی کی اعلانیہ مخالفت کا سامنا تھا۔ فیصلہ جزل اسمبلی میں ہونا تھا، جہاں 192 رکن ممالک برابری کی بنیاد پر ووٹ ڈالتے اور اقوام متحده کے منشور میں ترمیم کا فیصلہ دو تہائی اکثریت سے ہوتا۔ سلامتی کونسل کی توسعہ کا سوال کیونکہ عالمی سیاست سے متاثر ہونا ہی تھا لہذا مختلف تجویزی اور لابی گروپ سامنے آئے۔

پہلی تجویز: مارچ 2005ء میں سکرٹری جنرل نے تجویز کیا تھا کہ سلامتی کو نسل میں ویٹو کے حامل ارکان کی تعداد 5 سے بڑھا کر 9 کر دی جائے اور غیر مستقل منتخب نشتوں کو 10 کی بجائے 15 کر دیا جائے۔ اس تجویز میں ممالک کے درمیان ہونے والی گفت و شنید میں کچھ ممالک نے مستقل ارکان کی تعداد 9 کرنے کی بجائے گیارہ کرنے کی تجویز پیش کی تاکہ چار امیدوار ممالک (بھارت، بریتانیا اور جمنی) کے علاوہ افریقہ سے جنوبی افریقہ، مصر اور ناگیر یا جیسے اہم ممالک میں سے کسی دو کو مستقل رکن بنانے کا راستہ نمائندگی لی جائے۔ مستقل ارکان کی تعداد بڑھانے کی (چار امیدوار ممالک کے علاوہ یورپ اور دیگر براعظموں کے دیگر کئی ممالک بھی شامل ہوں)۔ اس تجویز کو اچھی خاصی حمایت حاصل تھی اور تو قعیہ تھی کہ اگر اقوام متحده کے چارٹر میں ترمیم کا کوئی مسودہ اس سال پاس ہوتا تو اسی تجویز کی بنیاد پر ہوتا۔

دوسری تجویز: سلامتی کو نسل کی توسعی کی بجائے مگر ویٹو کا اختیار کم کر دیا جائے۔ مستقل ارکان کی تعداد میں 8 کا اضافہ ہو جس کا مطلب ہے کہ مستقل ارکان کی تعداد 13 کر دی جائے اور نئے ارکان کی رکنیت کو توثیق سے مشروط کیا جائے۔ اس تجویز کو پاکستان، اٹلی اور ترکی کی حمایت حاصل تھی۔ اس کے اجلاس میں 20 ممالک شامل ہوئے۔ اس کو ”کافی گروپ“ بھی کہا جاتا ہے۔ اس تجویز کے تحت نشتوں کو علاقائی لحاظ سے تقسیم کرنے کی سفارش کی گئی۔ شمالی اور جنوبی افریقہ سے ایک ایک ملک، جنوبی ایشیا سے دو، مشرق بعید سے ایک اور لاطینی امریکہ سے ایک یا دو ممبر بنانے کی سفارش کی گئی۔ ادھر آسٹریلیا نے اپنے علاقہ سے انڈونیشیا کے لیے سلامتی کو نسل کی مستقل نشست کے لیے حمایت کی۔ اس گروپ کی تجویز کو ایک حد تک کیندیا کی حمایت بھی حاصل تھی۔

بھارت کو سلامتی کو نسل کی توسعی کی ہر تجویز میں فائدہ تھا اور اس کی نشست تقریباً یقینی تھی۔ یہ بات حکومتِ پاکستان کے لیے بڑی پریشانی کا باعث تھی۔ اس لیے اقوام متحده میں تجویز اور دنیا میں سفارتکاری میں تمام تر کوشش یہ تھی کہ یا تو بھارت کو مستقل رکن ہونے کے ناطے ویٹو اختیارات نہ مل پائیں یا پھر کسی طرح پاکستان کو بھی سلامتی کو نسل کی مستقل رکنیت

حاصل ہو جائے۔ لیکن حکومت پاکستان نے ملک کو مستقل رکنیت کا امیدوار ظاہر کرنے کا خطرہ مول نہیں لیا کیونکہ بھارت کی کسی بھی ملک نے مخالفت نہیں کی اس کے مقابله میں پاکستان کی رکنیت کی مخالفت ہو جاتی (جو افغانستان بھی کر سکتا تھا) تو بہت زیادہ سبکی ہوتی۔ جون 2006ء میں OIC (اسلامی ممالک کی تنظیم) کے وزراء خارجہ کی میں میں کانفرنس کے ذریعے پاکستان نے یہ تجویز پیش کی کہ سلامتی کو نسل میں اسلامی ممالک کے نمائندے کو مستقل رکنیت عطا کی جائے جو انہی کی غیر معقول تجویز تھی۔ ایک تو یہ کہ ادا آئی سی اس بات کا فیصلہ کیسے کرے گی کہ ان کی نمائندگی کون سا ملک اور کس بنیاد پر کرے۔ دوسرے اگر اقوام متحده کے اداروں میں مذہبی بنیادوں پر نمائندگی کا اصول لا گو کرنا ہو تو پھر دیگر مذاہب کے لیے بھی ایسا ہی انتظام سوچنا پڑے گا جس سے اقوام متحده کے مذہبی بنیادوں پر تقسیم ہو جانے کا خطرہ پیدا ہو جائے گا۔

تمیری تجویز: سلامتی کو نسل کے موجودہ انتظام کو برقرار رکھا جائے۔ زیادہ سے زیادہ ایک یادو مستقل ارکان کا اضافہ کر لیا جائے۔ اس تجویز کو امریکہ کی طرف سے پیش کیا جا رہا تھا۔ صدر بیش کی طرف سے اقوام متحده میں جان بولٹن کا امریکہ کے سفیر کی حیثیت سے تقریبی اسی سوچ کا سلسلہ تھا، چونکہ بولٹن اقوام متحده پر سخت تقيید اور کثیر القومی اقدامات کے مخالف کی شہرت رکھتے ہیں۔ امریکی انتظامیہ کے خیالات اور مفادات تو ایک طرف لیکن اقوام عالم جو ایک عرصہ سے ویٹو اختیارات اور اقوام متحده کے نظام کو غیر منصفانہ کہہ کر ہدف تقيید بناتے آئے تھے، اب وہ سیاسی تقاضوں کے پیش نظر سلامتی کو نسل کی توسعے کے عمل میں فعال کردار ادا نہیں کر پائے۔ ورنہ یہ منطقی بات ہے کہ اقوام متحده کی تشکیل کے وقت 1945ء میں اس کے ارکان کی تعداد 51 تھی تو سلامتی کو نسل کے ارکان کی کل تعداد 11 تھی پھر 1965ء میں UNO کے رکن ممالک کی تعداد 112 ہو گئی تو سلامتی کو نسل میں پانچ غیر مستقل ارکان کا اضافہ کرنے سے کو نسل میں شرکت کا عمل بڑھا۔ اب جبکہ کل ارکان کی تعداد 192 ہو چکی تھی تو سلامتی کو نسل کو جمہوری بنانے کا یہی طریقہ تھا کہ اس کی رکنیت (مستقل اور غیر مستقل) میں توسعہ کی جائے تاکہ سلامتی کو نسل میں ہونے والے فیصلوں میں زیادہ ممالک کی رائے شامل ہو۔ امریکی

انظامیہ کو عراق میں فوجی کارروائی کے لیے سلامتی کو نسل میں حمایت حاصل کرنے میں شکست کا سامنا ہوا۔ امریکہ کے لیے اس مجوزہ اضافے کے بعد بین الاقوامی معاملات میں اس فورم سے مرضی کے فیصلے کروانے کے امکانات انتہائی کم ہو گئے۔ لہذا سلامتی کو نسل کے ارکان میں اضافے کی امریکی مخالفت تو سمجھ آتی ہے۔ دیگر ممالک کی طرف سے سلامتی کو نسل کو موثر بنانے میں تامل سمجھ سے بالا ہے۔

دیگر اصلاحات

سلامتی کو نسل کے علاوہ جو اصلاحات اور اقدامات تجویز کیے گئے ہیں ان میں اقوام متحده کی انتظامی صلاحیت یا مینجنٹ کو بہتر بنانے، فروع جمہوریت کے لیے فنڈ اور ادارہ قائم کرنے اور غربت کے خاتمه کے لیے اقدامات یقیناً بہت عمدہ تجویز تھیں۔ جنہیں عالمی سطح پر عمومی تائید بھی حاصل تھی۔

ان کے علاوہ مجوزہ اصلاحات کا ایک اور اہم پہلو انسانی حقوق کے نئے اداروں کی تشكیل اور انہیں موثر بنانے سے متعلق تجویز تھیں۔ اقوام متحده کے چھ بنیادی اداروں (جزل اسٹبل، سلامتی کو نسل، تولیتی کو نسل، عالمی عدالت انصاف، اقتصادی و سماجی کو نسل اور سیکریٹریٹ) میں انسانی حقوق کے معاملات اقتصادی و سماجی کو نسل کے کام کا حصہ تھے۔ جس کے رکن ممالک 54 ہوتے ہیں۔ جنہیا میں ہر سال مارچ، اپریل میں انسانی حقوق کا کمیشن اسی کو نسل کے تحت کام کرتا تھا۔ جس میں 54 ممالک رکن ہوتے تھے۔ انسانی حقوق کے معاملات پر تقيید اور کارروائی سے بچنے کے لیے رکن ممالک نے اس کمیشن کے اندر نظام کو بے بس کر کھا تھا۔ حتیٰ کہ اس کمیشن کی سربراہی کئی مرتبہ ایسے ممالک کو مل گئی جن کی اپنے ملکوں میں انسانی حقوق سے متعلق کارکردگی انتہائی قابل اعتراض تھی۔ نتیجہ یہ کہ جہاں سلامتی کو نسل پر اعتراض تھے وہاں انسانی حقوق کے اداروں اور عہدوں کے سلسلہ میں معیار اور اہلیت کا تعین کرنا ضروری ہو گیا تھا۔

سیکرٹری جزل کی تجویز یہ تھیں

- اقتصادی و سماجی کو نسل اور کمیشن کو ختم کر کے ایک کو نسل برائے انسانی حقوق قائم کی جائے جس کی رکنیت محدود (25) ہو اور رکنیت بے شک محدود (چند سال کے لیے) ہو مگر اس کے لیے شرائط رکھی جائیں۔ مثلاً کمن ملک اپنے عوام کو انسانی حقوق کا تحفظ دینے میں اچھی کارکردگی اور شہرت رکھتا ہو۔ انسانی حقوق کے معاملہوں کی پاسداری کرتا ہو۔
 - مجوزہ کو نسل حقوق کی صورت حال کی نگرانی کرے اور انسانی حقوق پر عمل درآمد کروانے کے لیے نظام و طریقہ وضع کیے جائے۔ تاکہ اس کے فیصلوں کے موثر نفاذ کا کوئی انتظام موجود ہو۔
 - ہائی کمشنر برائے انسانی حقوق کے عہدہ اور اس کے دائرة کارکو موثر بنایا جائے۔
- 27 مئی 2005ء کو سیکرٹری جزل کی ہدایت کے مطابق ہائی کمشنر برائے انسانی حقوق محترمہ لوئیس آبور جو کینڈا کی سابق نجی تھیں، انہوں نے اپنے منصب کے حوالہ سے اصلاحات کا ایک پلان پیش کیا۔ جس میں تجویز کیا گیا کہ انسانی حقوق کے معاملات میں ہنگامی صورت حال سے نمٹنے کے لیے انہیں انسانی اور مالی وسائل اور ماہرین کی ایک ٹیم کی معاونت مہیا کی جائے۔ نیز بحران کے شکار ممالک صورت حال پر قابو پانے میں تعاون کی یقین دہانی کروائیں۔ مجوزہ انسانی حقوق کو نسل ملک کی کارکردگی کو مستقل بنیادوں پر چیک کرنے کا نظام بھی اپنائے۔

15 مارچ 2006ء کو ایک 47 رکنی کو نسل کے قیام کی منظوری دے دی ہے لیکن دیگر اصلاحات 2017ء تک کچھ اصلاحات ہو چکی ہیں جذل اسمبلی نے ایک قرارداد کے ذریعے کو نسل سمیت دوسرے ادارے فی الحال برقرار رہیں گے۔

باتی مجوزہ اصلاحات پر بحث مباحثہ جاری ہے اور ملکوں کے درمیان مذاکرات بھی چل رہے ہیں۔ بلکہ بعض ممالک میں عوامِ الناس بھی اس بحث میں حصہ لے رہے ہیں اور یہ ہونا بھی چاہیے کیونکہ اقوامِ متحده اپنی تمام تر کمزوریوں کے باوجود انتہائی اہم اور قابل تعریف کام کر رہا ہے۔ اس کے نظام میں اصلاحات دنیا کے ہر خطے اور ہر انسان کے لیے دور رسم تنائی کی حامل ہیں۔ اقوامِ متحده کے ظاہر پیچیدہ اور وسیع نظام میں عام لوگ بھی اپنی دلچسپی کے مطابق حصہ ڈال سکتے ہیں اور اس کی مشینی کو استعمال کر کے انسانیت کے تحفظ کے امکان بھی بڑھا سکتے ہیں۔



جنیوا (سوئیٹزرلینڈ) میں واقع اقوامِ متحده کی عمارت



نیدر لینڈز کے شہر ہیگ میں واقع بین الاقوامی عدالت انصاف کا ایک منظر

بین الاقوامی عدالت انصاف سے بین الاقوامی فوجداری عدالت تک

8 ستمبر 2003ء کو نیویارک میں اقوام متحده سیکرٹریٹ ہال میں انٹریشل کریمنٹ کورٹ کے صدر فلپ کرشن نے تقریر کرتے ہوئے کہا ”ہم نے دیکھا ہے کہ دنیا میں وہ لوگ جن کے ہاتھ مثار چڑا رہے اور قتل عام جیسے جرم سے رنگے ہوتے ہیں، سزا سے بچ نکلتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ایک بین الاقوامی فوجداری عدالت قائم کی گئی ہے۔ اس عدالت کو کامیابی سے ہمکنار کرنے کے لیے حکومتوں اور عوام کی عملی حمایت کی ضرورت ہے، لیکن ”ہزاروں لرزشیں

حاکل ہیں لب تک جام آنے میں، کے مصدق آئی سی یا بین الاقوامی فوجداری عدالت کے قیام میں بے شمار مشکلات حاکل تھیں۔ اقوام متحده پر بلا سوچ سمجھے تقید کرنے کا برجام تو عام ہے۔ لیکن اس عالمی پلیٹ فارم کے توسط سے ہونے والی کوششوں میں حصہ لینے والوں کی تعداد انہائی کم ہے جبکہ اس کی بڑی بڑی کامیابیوں کو سہل سمجھا جاتا ہے۔ ماضی قریب میں ایک بڑی کامیابی بین الاقوامی فوجداری عدالت کا قیام تھا۔ 1998ء میں اقوام کے مابین ہونے والے روم معاهدے اور قانون کے مطابق 2003ء میں نیدر لینڈز کے شہر ہیگ (Hague) میں اس عدالت کا قیام عمل میں آیا۔ اور اس کے مختلف افعال کی تشکیل جاری ہے۔ اس سے پہلے اقوام متحده کے چھ کلیدی اداروں میں سے ایک بین الاقوامی عدالت انصاف بھی اسی شہر میں ہے۔

اہم بات یہ ہے کہ عدالت انصاف کا دائرہ کارمحض حکومتوں کے مابین ہونے والے معاهدات (Treaties) کی تشریح و تفصیل تک محدود تھا۔ اور محض حکومتوں کو رسائی حاصل تھی گویا یہ ایک دیوانی (سول) عدالت ہے جبکہ بین الاقوامی فوجداری عدالت میں افراد چاہے وہ حکمران ہوں یا نہ ہوں، ان کے خلاف نسل کشی (genocide) جتنی جرام اور انسانیت کے خلاف جرام کے مقدمات قائم کیے جاسکتے ہیں۔ علاوه ازیں ان کے خلاف جرام ثابت ہونے پر سزا کا نظام بھی وضع کیا گیا ہے اس سے پیشتر چلی کے ڈلٹیڑ پیو شے کے خلاف مقدمے میں عالمی سطح پر فوجداری نظام میں جو خلام موجود تھا اب اس کی کوپورا کرنے کا انتظام ہو رہا ہے۔

جزل پیو شے کے خلاف اُس کے دورِ حکومت میں 25 ہزار سیاسی ہلاکتوں کے مقدمہ میں چلی کی عدالت نے سزا نمائی تو عالمی سطح پر فوجداری انصاف کے متعلق کچھ اہم سوال سامنے آئے تھے۔

- دنیا بھر کے دساتیر میں ریاست کے اعلیٰ ترین عہدیداروں کو ان کے فرائض کی بجا آوری کے دوران سرزد ہونے والے جرام کی سزا سے مستثنی قرار دیا جاتا ہے۔ جس کی آڑ میں حکومتیں شہریوں پر ظلم و جر کرتی ہیں۔ اس چھوٹ (Impunity) کی حد کیا ہے؟ اور اس چھوٹ کے حوالے سے انسانیت کے خلاف جرام کو کیسے روکا جائے؟

• ایسے کسی مجرم کی بیرون ملک جا کر سیاسی پناہ لینے کی صورت میں دو ملکوں کے قوانین اور عدالتوں کے اختیار کے حوالے سے ٹکراؤ سے کیسے بچا جائے۔ کیونکہ ایک ملک کی عدالت نے سزا دی تو دوسرے ملک کی عدالت نے اپنے قانون کی رو سے اس ملزم کو سیاسی پناہ دے رکھی تھی۔ اس دوران مقدمہ کیسے اور کہاں چلے۔ کس ملک کی عدالت اور قانون کو اولیت دی جائے گی؟

• بین الاقوامی فوجداری عدالت کی تشکیل کے ساتھ ان سوالوں میں مزید ایک سوال کا اضافہ ہو گیا کہ انسانیت کے خلاف جرائم کے کسی ملزم کی گرفتاری کے لیے پولیس کہاں سے آئے گی؟ کس ملک سے تعلق ہوگا؟ اس کے اپنے اصلی ملک یا جہاں وہ رہائش پذیر ہے۔ انسانیت کے خلاف جرائم میں قتل عام اور جارحیت جیسے جرائم بھی شامل ہوں گے۔ بین الاقوامی فوجداری عدالت کی تیسری خاص بات یہ ہے کہ اس عدالت میں معاهدے میں شریک ممالک کے عام شہری بھی عدالتی کارروائی کا آغاز (مقدمہ دائر) کر سکتیں گے۔

عدالتِ انصاف میں جہاں دنیا بھر سے 15 قابل ترین جج جزء اسیبلی میں دو تہائی اکثریت سے منتخب کیے جاتے تھے اور اہلیت کا معیار یہ تھا کہ امیدوار اپنے ملک میں اعلیٰ ترین عدالت منصب کا / کی اہل ہو۔ فوجداری عدالت میں امیدوار کے لیے اہلیت تو وہی رکھی گئی ہے لیکن ان کا انتخاب جزء اسیبلی کی بجائے روم قانون (Rome Statute) کے معاهدے میں شریک ممالک دو تہائی اکثریت سے کریں گے۔ جبکہ جوں کی تعداد 18 رکھی گئی ہے۔

دنیا کے جو ممالک اسلحہ بنانے اور ان مقامات پر سپاٹائی کرنے میں ملوث ہیں جہاں قتل عام ہوتا ہے یا ہونے کا خطرہ ہے اور ایسے ممالک جہاں آمریت ہے یا وہ آمریت کی حمایت کرتے ہیں ان میں اس عدالت کے قیام پر انتہائی پریشانی کا عالم ہے۔ خاص طور پر امریکہ جو معاهدے پر دستخط کر چکا ہے اب اس کی تویثیت سے کمزرا رہا ہے بلکہ اپنے حلقة اثر کے دیگر ممالک پر دباؤ ڈال رہا ہے کہ وہ اس معاهدے کی تویثیت نہ کریں۔ حالانکہ دنیا بھر میں قانونی اسلوب کو مد نظر رکھتے ہوئے روم معاهدے کی رو سے قائم ہونے والی فوجداری عدالت

میں یہ بات تسلیم کی گئی ہے کہ اس عدالت میں ماضی کے واقعات اور خاص طور پر کوسوو (Kosovo) میں ہونے والی فوجی کارروائی جیسے اقدامات قابل تعزیر نہیں ہوں گے۔

پاکستان بھی معاهدے کو شرائط پر منظور کرچکا ہے۔ لیکن اس کی توثیق کرنے سے گریز کر رہا ہے۔ مگر بڑی کامیابی یہ ہے کہ بین الاقوامی سوچ کے حامل افراد، تنظیمیں اور ممالک مل جل کر عالمی فوجداری عدالت کی اہمیت میں کامیاب ہوئے۔ اس معاهدے پر 139 ممالک دستخط کرچکے ہیں اور 92 ممالک نے اس معاهدے کی توثیق یا اس میں مکمل شمولیت کر لی ہے۔ فوجداری عدالت میں ایک مقدمہ بھی دائر ہوچکا ہے۔ جسے جمہوری کانگو نے اپنے ملک میں باغیوں کے خلاف شکایات کی صورت دائر کیا ہے۔

ایک نئے عالمی عدالتی نظام کو بنانے میں کئی تکنیکی مسائل بھی آڑے آرہے ہیں۔ مقدمہ توہیگ میں قائم ہو گا لیکن ملزموں کو عدالت تک کیسے لاایا جائے گا؟ اس کے لئے فورس کہاں سے آئے گی؟ اقوام متحده کی جو فوج مختلف ممالک کی فورسز پر مشتمل ہوتی ہے وہ صرف امن فوج ہوتی ہے۔ فائیٹ آری نہیں ہوتی۔ ان تمام معاملات کا حل تلاش کیا جا رہا ہے۔ پروسکیوٹر اور جوں کی تعیناتی عمل میں آچکی ہے۔

بین الاقوامی فوجداری عدالت کا قیام بے شک خلاف انسانیت جرائم کی روک تھام اور حقوق کے تحفظ کے سلسلے میں اقوام کی ذمہ داری کا نیا احساس ابھارنے میں معاون ثابت ہو گا۔ یہ کامیابی خاص طور پر رسول سوسائٹی اور ان حکومتوں کی کامیابی ہے جو انسانی حقوق اور امن کے حوالے سے اجتماعی شعور کو عملی اقدامات کی طرف لے جا رہے ہیں۔

پاکستان میں انسانی ترقی کا بحران

وجاہت مسعود



کوئی بھی ریاست خواہ وہ مادی وسائل سے مالا مال ہو یا ان کی کمیابی سے دوچار ہو۔ اُس کی افرادی قوت اور بالخصوص اعلیٰ تعلیم و تربیت یافتہ افرادی قوت ہی اس کا بنیادی سرمایہ ثابت ہوتی ہے۔ وجہت مسعود پاکستان کے افرادی سرمایہ کی صورت حال کا مختصر جائزہ پیش کرتے ہیں جو آبادی کے اعتبار سے دُنیا کا چھٹا بڑا ملک ہے:

قومی سلامتی کی ریاست کے فکری بیانیے سے پاکستان میں زندگی کے ہر شعبے میں بحران پیدا ہوئے ہیں۔ بنیادی طور پر ریاست اور عوام میں عدم اعتماد، ادارہ جاتی شفافیت کا فقدان اور حکمرانی کے جواز سے نسلک اجتماعی بحران بہت آہستہ جدید اجتماعی کے مختلف حصوں میں خرابی کی صورتیں پیدا کرتا ہے۔ ریاست کو لاحق بنیادی خرابی سے نظریں چرانے کا ایک ڈھنگ یہ ہے کہ مختلف شعبوں میں پیدا ہونے والی خرابیوں کو وسیع تر تناظر سے الگ کر کے دیکھا جائے۔ مثال کے طور پر زرعی پیداوار میں کمی اور آب پاشی سے نسلک مشکلات کو خالص تکنیکی مسائل قرار دے دیا جائے اور ان مسائل میں سیاسی عمل کی نوعیت کو نظر انداز کر دیا جائے۔

آبادی میں اضافے کی شرح کو اُس اقداری نظام سے جوڑ کر نہ دیکھا جائے جس میں افزائش آبادی کے موضوع پر گفتگو کو فاشی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ نصاب تعلیم پر غور و فکر کرتے ہوئے اُس کے موضوعات اور لغت کو قومی سیاسی مکالے سے الگ کر کے دیکھا جائے۔ صحافت کو مدعیت سے الگ کر کے دیکھا جائے۔ فلمی صنعت کو درپیش مسائل کا تجربہ کرتے ہوئے علمی اور تمدنی رہنمائی کو نظر انداز کر دیا جائے۔

اسی حکمت عملی کا ایک پہلو یہ ہو سکتا ہے کہ مختلف شعبہ ہائے زندگی میں پیدا ہونے والی خرابیوں کو ایک سادہ اور گمراہ کن جواز کے ذریعے سمجھنے کی کوشش کی جائے مثلاً ”بھارت ہمارا ہمسایہ ہے جو رقبے اور آبادی نیز وسائل کے اعتبار سے ہم سے بہت بڑا ہے۔ بھارت سازشوں کے ذریعے ہمارے لیے مشکلات پیدا کر رہا ہے۔ اس کے ساتھ ایک فیصلہ کن معرکے میں کامیابی حاصل کیے بغیر ہماری مشکلات ختم نہیں ہو سکتیں“۔ اسی طریقہ کار کا ایک مظاہرہ حالیہ برسوں میں دیکھنے میں آیا جب عوام کو یہ باور کرایا گیا کہ تین نومبر 2007ء کی عدیلیہ بحال ہونے سے پاکستان کے سارے مسائل ختم ہو جائیں گے۔ اب کچھ عرصے سے اس خیال کو فروغ دیا جا رہا ہے کہ ہمسایہ ملک افغانستان میں امریکا کی موجودگی ہماری معاشی، سیاسی اور معاشرتی خرابیوں کی اصل وجہ ہے۔ اس طریقہ کار میں رجعت پسند سیاست کے لیے بہت سی سہولتیں ہیں۔ رائے عامہ کو اپنی تجزیاتی تو انائیں صرف کرنے کے لیے ایک غیر حقیقی ہدف میسر آ جاتا ہے۔ قوی بحران کی اصل وجوہات سے توجہ ہٹ جاتی ہے اور عوام میں تعصب، کم علمی اور تفریق جیسے مقنی رجحانات فروغ پاتے ہیں۔

زیادہ حقیقت پسندانہ طریقہ کار یہ ہو گا کہ ملک کو درپیش سیاسی، سماجی اور معاشی مسائل کا الگ الگ تجزیہ کیا جائے۔ خرابی کی کیفیت، نوعیت اور شدت کا اندازہ لگایا جائے۔ دوسرے مرحلے میں ان مختلف مشکلات کے باہم تعلق کا کھوج لگایا جائے۔ مثال کے طور پر آب پاشی کے بحران کا وفاق کی اکائیوں میں موجود تعلقات سے کیا تعلق ہے۔ شہری منصوبہ بندی اور ٹرینک کے مسائل کا آبادی میں اضافے سے کیا تعلق ہے؟ آبادی میں اضافے کا خواندگی کی شرح سے کیا تعلق ہے؟ خواندگی اور اعلیٰ تعلیم کے مسائل کس طرح ایک دوسرے سے جوڑے ہوئے ہیں؟ ناخواندگی کی بڑھتی ہوئی شرح کا معاشی ترجیحات سے کیا رشتہ ہے؟ معاشی ترجیحات کے درست نہ ہونے کا جمہوری عمل کی کمزوری سے کیا تعلق ہے؟ جمہوری عمل کے انحطاط اور سیاسی جماعتوں کی کمزوری میں کیا تعامل پایا جاتا ہے؟ سیاسی جماعتوں کی شفاقت کا زرعی ملکیت کی نوعیت سے کیا تعلق ہے؟ ذرائع ابلاغ کی پس ماندگی کس طرح جمہوری

قدروں سے انماض پر ملچھ ہوتی ہے؟ تیسرا مرحلے میں ان تمام بجرانوں میں مشترک نکات کی نشاندہی کی جائے۔ مختلف شعبوں میں صورت حال کو بہتر بنانے کے لیے شعبہ جاتی اقدامات کی نشاندہی کرنے کے علاوہ اُس بنیادی خرابی کا سراغ لگایا جائے جس کی موجودگی میں قومی بحران کے جملہ پہلوؤں میں موثر اور دیرپا بہتری لانا ممکن نہیں۔

اس وقت پاکستان کو درپیش انسانی ترقی کے بحران کا ایک اہم پہلو یہ ہے کہ قومی تحفظ کے نام پر قائم قومی سلامتی کی ریاست کو کس طرح ایسے جمہوری بندوبست میں تبدیل کیا جائے جو شہریوں کے تحفظ، اقتصادی ترقی اور اجتماعی وقار کی ضمانت دے سکے۔ قومی سلامتی کی ریاست کو عوامی فلاجی ریاست میں تبدیل کیے بغیر نہ فوج کی سیاسی اور تمدنی قوتوں پر بالادستی ختم ہو سکتی ہے اور نہ جمہوری طرز حکمرانی کو استحکام مل سکتا ہے۔

دوسری بھر میں ماہرین کسی ملک میں انسانی ترقی کو تین بنیادی پیانوں سے ناپتے ہیں۔ (اول) شہریوں کے طویل اور صحیت مند زندگی گزارنے کے امکانات کیا ہیں؟ یعنی پیدائش کے وقت متوقع عمر کیا ہے؟ (دوم) شہری کتنے تعلیم یافتے ہیں؟ اس کے لیے بالغ شرح خواندگی نیز پرائزمری، سینئری اور ہائی سکول کے لیے داخلے کی شرح کو ملائکر تعلیمی حالت کا تعین کیا جاتا ہے۔ (سوم) متعلقہ ملک کے باشندوں کے لیے باوقار زندگی گزارنے کے موقع کیا ہیں؟ معیار زندگی میں بہت سے دیگر امور کے علاوہ شہریوں کی قوت خرید کو بنیادی اہمیت دی جاتی ہے۔

پاکستان میں آبادی میں اضافے کی شرح دو فی صد سے زائد ہے۔ ٹیونس اور ایران میں آبادی میں اضافے کی شرح ایک فی صد سے بھی کم ہے۔ بھارت، سری لنکا، نیپال اور بگلادیش میں آبادی میں اضافے کی شرح پاکستان سے کم ہے۔ آبادی میں اضافے کی موجودہ شرح برقرارر ہے تو پاکستان میں معاشی ترقی کا کوئی بھی منصوبہ کامیاب نہیں ہو سکتا۔

2012ء میں اقوام متحده کے مطابق پاکستان میں اوسط عمر 22.23 برس ہے۔ گویا آبادی کی اکثریت نوجوان ہے جن کی بڑی تعداد آئندہ چند برس میں افزائش نسل کے عمل میں شریک ہو گی جس سے مستقبل میں آبادی میں اضافے کی شرح مزید بڑھنے کا امکان ہے۔

ورلڈ بینک کے 2015ء کے اعداد و شمار کے مطابق پاکستان میں پیدائش کے وقت متوقع عمر 66 برس ہے۔ پاکستان کے ہمسایہ ممالک میں پیدائش کے وقت متوقع عمر چین میں 76، ایران میں 76 اور بھارت میں 68 برس ہے۔ اس وقت دنیا کے 114 ممالک میں پیدائش کے وقت متوقع عمر 74 برس سے زائد ہے۔

پاکستان میں بالغ شرح خواندگی سرکاری اعداد و شمار کے مطابق 58 فیصد کے قریب ہے۔ تاہم بچوں میں تینوں تعلیمی سطحوں پر داخلے کی شرح کل ملا کر 40 فیصد سے زیادہ نہیں اور اس اشارے پر پاکستان دنیا کے 182 ممالک میں 155 ویں نمبر پر ہے۔ پاکستان غالباً دنیا کا واحد ملک ہے جہاں آج ناخواندہ افراد کی مطلق تعداد 50 برس پہلے کے مقابلے میں 200 فیصد زیادہ ہے۔ پاکستان تعلیم پر کل قومی پیدوار کا 2.6 فیصد خرچ کرتا ہے۔ اسرائیل کل قومی پیدوار کا 9.6 فیصد، نیپال 3.4 فیصد، بھارت 2.7 فیصد اور بیگلہ دیش 2.7 فیصد تعلیم پر خرچ کرتے ہیں۔

آج کی دنیا میں غربت کو صرف روپے پیسے کی کی ہی سے نہیں بلکہ بنیادی ضروریات مثلًا خوراک، پینے کے صاف پانی، تعلیم، رہائش اور علاج معالجہ سے محرومی کی بنیاد پر بھی پرکھا جاتا ہے۔ پاکستان میں 39 فیصد شہریوں کی روزانہ فی کس آمدنی 2 ڈالر سے کم ہے۔ یوائی ڈی پی کے مطابق پاکستان میں 39 فیصد آبادی غربت کی سطح سے بھی نیچے زندگی گزارنے پر مجبور ہے۔ پاکستان میں 39 فیصد شہریوں کو پینے کے صاف پانی تک رسائی حاصل نہیں ہے۔ 77 فیصد دیہی آبادی کو سرکاری طور پر مہیا کیا گیا صاف پانی میسر نہیں ہے۔ پاکستان میں سفر، علاج معالجہ، تعلیم، تفریح کی سہوتیں ناگفته ہیں۔ پاکستان کے شہروں میں صفائی اور حفاظان صحت کا انتظام نہایت خراب ہے۔ پورے ملک میں چند مقامات کو چھوڑ کر ٹوٹی ہوئی سڑکیں اور گرداؤ لودگلیاں پانی جاتی ہیں جن میں جگہ جگہ پانی کے جوہڑ اور گندگی کے ڈھیر نظر آتے ہیں۔

لاکھوں کی آبادی رکھنے والے شہروں میں لاہوری نام کی شے عنقا ہے۔ اسلام آباد شاید دنیا کا واحد دارالحکومت ہے چند سال پہلے تک جہاں ایک بھی سینما نہیں تھا۔

انسانی ترقی کی اس ناگفتوں بہ صورت حال کا مبتوجہ معاشری، تمدنی اور علمی پس ماندگی کی صورت میں برآمد ہوا ہے۔ انسانی ترقی کے ماہرین کی اصطلاح میں پاکستان میں انسانی سرمائے کا معیار کم تر ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ پاکستان کے باشندے صلاحیت یا ذہانت کے اعتبار سے دوسری قوموں سے پیچھے ہیں بلکہ پاکستان کا انسانی سرمایہ اس لیے کم تر نو عیت کا حامل ہے کہ پاکستانی ریاست نے اداروں اور پالیسیوں کی سطح پر اس امر کو یقین نہیں بنایا کہ شہریوں کی صلاحیت اور امکان کو پوری طرح بروئے کار لایا جاسکے۔

کسی عام پاکستانی سے بات کی جائے تو وہ مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والے اعلیٰ کارکردگی کے حامل افراد کی ایک فہرست گنودیتا ہے۔ حب الوطنی کے جوش میں کچھ معروضی حقائق کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ پاکستان کے 62 برسوں میں نمایاں کارکردگی دکھانے والے پیشتر شہری قیام پاکستان سے قبل، ہی اپنی تعلیم اور تربیت ختم کر چکے تھے۔ ان کے بعد کی نسلوں میں جن پاکستانیوں نے اچھی کارکردگی دکھائی ان کی بڑی تعداد نے بیرون ملک تعلیم پائی ہے یعنی اپنے شہریوں کی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے میں پاکستان کے اداروں کو دخل نہیں۔ گذشتہ کئی عشروں سے پاکستان انسانی سرمائے کے انخلا کا شکار ہے۔ گویا پاکستان کے علمی، معاشری اور انتظامی ادارے باصلاحیت شہریوں کو جذب کرنے کی صلاحیت سے محروم ہیں۔

ایک تیسری قسم ان پاکستانیوں کی ہے جو کسی شعبے میں اچھی صلاحیت کا مظاہرہ تو کرتے ہیں لیکن ان کی کارکردگی میں تسلسل اور واضح حکمت عملی کا فقدان ہوتا ہے۔ بحثیت مجموعی پاکستان کے باشندے معروضی تجویی اور تفصیلی منصوبہ بندی کی صلاحیت سے بڑی حد تک محروم ہیں۔ پاکستان کے سیاسی رہنماؤں سے لے کر عسکری قیادت تک داؤ یقین میں حاضر دماغی کی مثالیں تو موجود ہیں لیکن طویل مدتی حکمت عملی کے ضمن میں پاکستانی شہریوں کی صلاحیت محل نظر ہے۔ علمی تحقیق کے ضمن میں پاکستان کا زیادہ حصہ ادبی تحقیق یا مذہبی موضوعات پر محیط ہے۔ سائنسی تحقیق، ایجادات، عمرانی ایجنس اور تحریکاتی رہنمائی کے ضمن میں پاکستانیوں کی کارکردگی نہ ہونے کے برابر ہے۔ پاکستان میں علمی اور تمدنی مکالمہ رک گیا ہے کیونکہ نظریاتی تقدیس کی آڑ میں اظہار رائے کی آزادی اور انشورانہ دیانت کو دبادیا گیا ہے۔

آبادی کے لحاظ سے دنیا کے چھٹے بڑے ملک پاکستان میں اعلیٰ تعلیم کا ایک بھی ایسا ادارہ نہیں جسے عالمی معیار کے پہلے 500 تعلیمی اداروں میں بھی شمار کیا جاسکے۔ دنیا بھر میں علم کے فروغ اور شینا لو جی کی ترقی کے باعث نوجوانوں کی صلاحیت اور کارکردگی بچھلی نسلوں سے بڑھ کر ہے لیکن پاکستان میں نمایاں یا اوسط کارکردگی کا مظاہرہ کرنے والا جو شخص رخصت ہوتا ہے، اپنے پیچھے ایک خلا چھوڑ جاتا ہے کیونکہ مطلوبہ تعداد میں مسابقت پذیر تعلیمی اور پیشہ و رانہ استعداد رکھنے والے نوجوان سامنے نہیں آ رہے۔

انسانی ترقی کی شرم ناک صورت حال پاکستان کا ایک ایسا بھرمان ہے جو آئندہ کئی عشروں تک پاکستان کی مجموعی پس مانگی کی صفائت دیتا ہے۔ تعجب انگیز امر یہ ہے کہ اس ملک کی قیادت انسانی سرمائے کے اس اخبطاط سے مکمل طور پر لائق نظر آتی ہے۔ اگر انسانی ترقی مسائل کی پیش گوئی کرنے، اُن کا تجزیہ کرنے اور انھیں حل کرنے کی صلاحیت کا نام ہے تو پاکستان انسانی ترقی کی دوڑ میں بہت پیچھے ہے۔

پاکستان کی معیشت کی پس مانگی انسانی ترقی کے اس بھرمان سے جڑا ہوا مسئلہ ہے۔ پاکستان کے بارے میں سرکاری طور پر کہا جاتا ہے کہ یہ ایک زرعی ملک ہے۔ یہ بیان گویا معیشت کی پس مانگی کا با الواسطہ اقرار ہوتا ہے کیونکہ آج کی دنیا میں زراعت پر انحصار کرنے والی معیشت صنعتی معیشت رکھنے والے ممالک کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ دوسری طرف زرعی ملک ہونے کے باوجود پاکستان اپنی آبادی کی خواک کی ضروریات پوری کرنے سے قاصر ہے۔

گزشتہ کئی عشروں سے پاکستان کی معیشت سیاسی عدم انتظام، بیرونی سرمایہ کاری کی نچلی سطح نیز درآمدات اور برآمدات کے توازن میں خسارے کے باعث اخبطاط کا شکار ہے۔ پاکستان معاشری سروے کے مطابق گزشتہ مالی سال (2016-2017) کے دوران معاشر نمو 5.28 فی صدر ہی جو کہ مقررہ ہدف 5.7 فی صد سے کم ہے۔ حقیقی مالیاتی خسارہ 3.8 فی صدر ہے۔ افراد افراد افراد زر کی اوسط شرح 4.1 رہی۔ بے روزگاری کی شرح 5.9 فی صد ہے اگرچہ پاکستان میں بے روزگاری کا تعین کرتے ہوئے ملک کی نصف سے زیادہ آبادی یعنی عورتوں کو

ہرے سے شمار نہیں کیا جاتا۔ مجموعی ملکی قرضہ 208 ٹریلیون ہے جبکہ سرمایہ کاری کی شرح مجموعی ملکی پیداوار کا 15.78% فی صدر ہے جبکہ اس کا ہدف 17.7 فی صد تھا۔ لیکن ترسیلات اپنے ہدف کے مقابلے 1100 ارب کم وصول پائیں۔ پاکستان کی برآمدات 48.58 ارب ڈالر جبکہ درآمدات 21.69 ارب ڈالر ہیں۔ پاکستان میں 74 ملین افراد (39 فی صد) خط غربت سے نیچے زندگی گزار رہے ہیں۔

پاکستان کی معاشری بدحالتی کی بنیادی وجہ ہماری معاشری ترجیحات ہیں۔ ماہرین معیشت پاکستان کو 'دفاعی معیشت' کا نمونہ قرار دیتے ہیں۔ پاکستان دُنیا کے ان ممالک میں شامل ہے جہاں سالانہ بجٹ میں دفاعی اخراجات کی تفصیل بیان کرنے کی وجہے عمومی اعداد و شمار دیے جاتے ہیں۔ تاہم دفاعی بجٹ کے سرکاری طور پر بیان کردہ اعداد و شمار بھی درست تسلیم کر لیے جائیں تو پاکستان اپنے دفاع پر سویڈن، ناروے، بھیم، ڈنمارک، آسٹریا، سوئٹرلینڈ اور نیوزی لینڈ جیسے ترقی یافتہ ممالک سے زیادہ رقم خرچ کرتا ہے۔

کوتوال



فہمیدہ ریاض

کوتوال بیٹھا
کیا جواب دیں اُس کو
جان ایسی کانپی ہے
کچھ عیال نہ ہو جائے
جو گزرگئی دل پر
وہ بیال نہ ہو پائے
کوتوال بیٹھا ہے
ہاں لکھوکہ سب تجھے ہے
سب درست الزامات
اپنا جرم ثابت ہے
ہن پڑا تو کچھ بڑھ کے
پھروہ گیت چھیڑیں گے
دست بستہ ہر مظلوم
جموں اٹھے جنمیں گا کر
آمری خوست ہے
چھیڑا ہے یہ قانون
باغیوں کے قدموں کی
دھول اس سے جھاڑیں گے
خارخس سے کمتر ہو
راستے کا کنکر ہو

جس نے راہ گھیری ہے
وہ تمہارا آقا ہے
ہم نے دل میں ٹھانی ہے
راہ صاف کر دیں گے
تم کہ صرف نوکر ہو
تم کو معاف کر دیں گے

(یہ نظم پاکستانی سوسائٹی کے تجربات کی عکاسی کرتی ہے)

پاکستان میں انسانی حقوق کی تحریکیں

ایک سرسری جائزہ

انسانی معاشرہ مسلسل تبدیلی و ارتقا کی حالت میں رہتا ہے۔ اس کی فلکری، معاشی، معاشرتی و سیاسی سرگرمیاں ان رجحانات کا تعین کرتی ہیں جو اجتماعی رُخ یا سمٹ کا پتہ دیتے ہیں۔ پاکستان میں بھی کئی سماجی تحریکیں چلتی رہیں اور اب بھی جاری ہیں جو شہریوں کی جانب سے اجتماعی احساسِ نمودی عکاس ہیں۔ کہیں یہ خیرات، صدقہ کے جذبے کو کسی ادارتی شکل میں ڈھانے کی کوشش میں ظاہر ہوتی ہیں تو کہیں آرٹ اور موسیقی کی ترویج کرنے میں۔

کہیں گروہی اور شہری حقوق کا دفاع سماجی تحریکوں کا مقصد و موضوع رہا۔ اس لحاظ سے یہ سب انسانی حقوق کی آفاقی یا عالمی تحریک کا حصہ بھی ہیں کیوں کہ ان کا ناطہ کہیں نہ کہیں انسانی ترقی اور حقوق کے عالمی رجحانات سے جڑتا ہے۔ ایسی جدوجہد انسانوں کو مساوی درجہ، آزادی و تحفظِ ایوانے کے مقصد کے تحت ہوا سے تولازی طور پر انسانی حقوق کی تحریک میں شمار کیا جائے گا۔ چاہے فی الوقت یہ مخفی مادری زبان، روزگار یا صحت عامہ کے موضوعات یا مزدوروں، عورتوں یا نہبی اقلیتوں کے حقوق کو فوکس کر رہی ہو بالآخر یہ انسانی برابری کا کلچر قائم کرنا چاہتی ہیں۔

مندرجہ بالا تعریف میں تو سینکڑوں ادارے، تحریکیں اور ہزاروں تنظیمیں آتی ہیں سب کا ذکر ممکن نہیں۔ کچھ ایسی تنظیمیں اور رجحانات بھی معاشرے کا حصہ ہو جاتے ہیں جنہیں جدید عمرانیات میں منفی سماجی قوتیں کہا جاتا ہے۔ جہاں عوامی تنظیموں کا ایجاد واضح اور مقاصد حاصل کرنے کے ذرائع عیاں (open) ہوتے ہیں وہاں منفی سماجی قوتیں طاقت اور

دھنس کے بل بوتے پر اپنی سیاسی سماجی سوچ معاشرے پر یا نظامِ ریاست پر لاگو کرنا چاہتی ہیں۔ یہ کسی غیر قانونی اور در پرداہ سرگرمی میں ملوث پائی جاتی ہیں۔ منفی سماجی قوتوں کی ایک نشانی تشدد کی کسی نہ کسی سطح پر قبولیت یا وکالت بھی ہے۔

البته اعلانیہ یا یہ احتجاج کے ذریعے قانون کو عالمتی طور پر توڑنا الگ بات ہے جس کی مثالیں ماضی و حال میں یہ یہ نافرمانی کے طور پر لکھیں ادا کرنے سے انکار یا جبری فوجی خدمات میں حصہ لینے سے انکار اور سزا کیلئے تیار ہونے میں ملتی ہیں۔

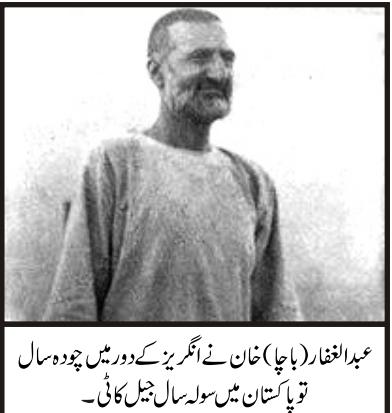
عوامی تنظیموں اور تحریکوں میں بھی قدیم اور جدید سوچ کی حامل قوتوں کے میلان تمام معاشروں میں پائے جاتے ہیں۔ انسانی حقوق کی تحریکوں، تاریخی واقعات اور حکومتوں کی طرف سے اقدامات کے درمیان فرق تو ہے مگر ان کا آپس میں گہرا تعلق بھی ہے۔ بعض واقعات انسانی حقوق کی تحریکوں کو جنم دیتے ہیں تو تحریکیں قوموں کی زندگی میں اہم واقعات اور سنگ میل ثابت ہوتی ہیں۔ ریاستوں کی طرف سے انسانی حقوق کا تسلیم کرنا اہم ہوتا ہے لیکن حقوق کی تحریکیں عوامی سطح پر چلتی ہیں۔ عوام کے مسائل بے شمار ہوتے ہیں اور حکومتوں کو درست یا غلط اپنی ترجیحات عزیز ہوتی ہیں۔ بسا اوقات حکومتیں عوامی تحریکوں کو شرف قبولیت تباہی ہیں جب ان کیلئے ایسا کرنا ناگزیر ہو جائے۔



انسانی حقوق کا ارتقا

انسانی حقوق کی تحریک کے

کہا جائے۔ حقوق کے کسی بھی ضمن اور علاقت میں ہونے والی جدوجہد جو انسانوں کو مساوی حیثیت دلانے کیلئے ہو اور قوموں کے اجتماعی حافظے میں کوئی نقش چھوڑ جائے، ایسی جدوجہد کو انسانی حقوق کی تحریک کہا جائے گا، حمایت یا مخالفت کرنے والوں کی تعداد سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ لکھنی کامیاب لکھنی ناکام اس سے قطع نظر تشدد سے پاک اجتماعی بھلائی کیلئے دلیل



عبدالغفار (باقا) خان نے اگریز کے دور میں چودہ سال تو پاکستان میں سول سال جیل کائی۔

اور مکالمے کے ذریعے سماج یا نظامِ ریاست میں تبدیلی کی کوشش انسانی حقوق کی تحریکوں کا طرہ امتیاز ہے۔

مسنوس رو جنی نایڈرو، سکھ دیو اور گاندھی جی کو کیسے فراموش کیا جاسکتا ہے؟ تاریخ کے ساتھ انصاف کرنا ہے تو پورا انصاف کیجیے۔

نو آبادیاتی دور کا اٹاٹہ اور ہم عصر تحریکیں

بر صغیر پاک و ہند، بگلہ دلیش کی سول سو سالی کو منظم ہونے کا جو موقعہ برطانوی تسلط کے ڈیڑھ دو سو سال میں ملا وہ اس سے پہلے تاریخ میں کبھی نہیں ملا تھا۔ لہذا سیاسی جماعتوں کے قیام سے لیکر علمی ادبی انجمنیں، ٹریڈ یونین وغیرہ کی روایت اسی نو آبادیاتی دور کی دین ہے، برطانوی مشرق پسندوں نے کچھ غلطیاں بھی کی لیکن ہندوستان میں احیاء علوم میں ان کا بڑا حصہ ہے۔ محض تعلیم و تدریس ہی نہیں، مقامی زبانوں کی ترویج بھی اسی دور میں ہوئی بعض مقامی زبانوں کی لغات اور گرائمر مغربی مشرق پسندوں نے مرتب کی۔ ٹریڈ یونین اور سیاسی جماعتوں کی بنیاد بھی انگریزوں کے ہاتھوں رکھی گئی۔ تاج برطانیہ کی حکومت میں پنپنے والی سول سو سالی پر قوم پرستی کے بعد مارکسی نظریات کی گہری چھاپ تھی لیکن تیسری اہم خصوصیت اس کا نسلی اور مذہبی تنوع تھا۔ یہ تنوع کہیں خوبصورتی پیدا کرتا تو کہیں مسائل کی وجہ بنتا ہے۔

بر صغیر کی جدوجہد آزادی کے لئے دو امکانات پر بہت زیادہ بحث مباحثہ ہوا۔ ایک پر امن سیاسی جدوجہد کا راستہ تھا اور دوسرا مسلح جدوجہد کا۔ سو بحاش چندر بوس سیاسی کے ساتھ مسلح جدوجہد پر بھی یقین رکھتے تھے۔ بلکہ جب وہ کانگریس کے صدر منتخب ہوئے تو ان کی سوچ کانگریس پر حاوی ہو چکی تھی۔ جس کا مطبع نظر تھا کہ سیاسی جدوجہد سے مطلوبہ نتائج حاصل نہیں کئے جاسکتے۔ لہذا دوسرے ذرائع اختیار کئے جائیں جو بوجہ ممکن نہ ہو سکے اور سو بحاش ہابو کو کانگریس کی صدارت سے استعفی دینا پڑا۔

جس خطہ کو پاکستان بناتھا اس میں چار قسم کے رجحان پائے جاتے تھے۔ ایک تو تحریک خلافت اور عطا اللہ شاہ کی بھرت جس میں انگریزی حکومت کی مخالفت کے ساتھ ساتھ حالات سے فرار کی سوچ تھی۔ اگر اس میں ریشمی رومال تحریک کو بھی شامل کر لیں تو ایک تشدید کا غصہ بھی تھا۔ دوسرے رجحان کا آغاز ایک جدا گانہ اقليٰتی ذہنیت سے ہوا اور مسلم قومیت پر ختم ہوا جس کی ایک مثال علامہ اقبال ہیں۔ تیسرا رجحان مقامی روایت میں گندھا ہوا لیکن ہندوستانی قومیت سے متاثر تھا جو آزادی کے علمبردار (خان عبدالغفار خان) تھے اور چوتھے میں ایسے لوگ تھے جو مارکسی نظریات سے متاثر تھے۔ مختلف ٹریڈ یونین، تنظیم ترقی پسند مصنفین اور کمیونٹ پارٹی کی جڑیں قیام پاکستان سے پہلے پھیلی ہوئی تھیں۔

بعداز 1947ء

قیام پاکستان کے بعد پہلا سوال زبان اور کلچر کے حوالہ سے ابھرا۔ تہذیبی اکائیوں میں عدم تحفظ اور اپنے حقوق کے متعلق فکر مندی پیدا ہوئی۔ بنگلہ دیش تحریک کی داغ بیل اس وقت پڑی جب 1948ء میں اردو کو واحد قومی زبان قرار دیا گیا۔ پھر بلوچستان میں خان آف قلات کو زبردستی پاکستان سے الحاق کروانا، سندھ اور فرنٹیر کی منتخب حکومتوں کو غیر آئینی طور پر برخاست کرنے سے بھی چھوٹی قومیوں میں عدم تحفظ بڑھا جس نے اس ضمن (زبان) میں ایک تحریک کو جنم دے ڈالا۔ مختلف قومیوں نے اپنی زبان، کلچر اور معاشی ترقی کے حوالے سے اپنی فکر مندی کا اظہار کرنا شروع کر دیا۔ غفار خان کے لئے سیاسی بنا پر جیل اور سختیاں کوئی نئی بات نہیں تھی اور پاکستان کے قیام کے حوالہ سے تحفظات کی وجہ سے شاید انہیں اپنے اوپر آنے والی اتفاق کا کچھ اندازہ بھی ہو لیکن مسلم لیگ کی بد عہدیوں اور بے اصولیوں نے تو جی ایم سید کو بھی علیحدہ ہونے پر مجبور کر دیا۔ جی ایم سید وہ سیاست دان تھے جنہوں نے 1946ء میں سندھ اسمبلی میں پاکستان بنانے کی قرارداد پیش کی اور پاس کروانے میں اہم کردار ادا کیا تھا۔ مولانا بھاشانی مشرقی پاکستان کے جمہوری اور وفاقی طرز سیاست کی نمائندگی کرتے تھے وہ بھی بندی خانوں میں ڈالے گئے۔ یہ سب معقوب قوم پرستوں کی پہلی کھیپ تھی۔

50 کی دہائی میں چند اور تحریکیں تھیں جنہوں نے خاطر خواہ کام کیا۔ ایک حیدر بخش جتوئی کی قیادت میں سندھ ہاری کمیٹی تھی۔ کسانوں کی تحریک دوسرے صوبوں میں بھی

سوشلسٹ قوتوں کے ساتھ رابطہ میں تھی۔ لیکن نوزائیدہ پاکستان کی افسرشاہی اور جاگیرداروں نے مل کر زرعی اصلاحات کے مطالبے کا رخ مزارعت کے قوانین کی طرف موڑ دیا۔ 1951ء میں صوبائی لحاظ سے قانون مزارعت (ایکٹ) نافذ کر دیئے گئے۔ ان قوانین سے کچھ دیر پہلے سرکاری سطح پر ایک ہاری کمیٹی بنی تو اس کی روپورٹ زمینداروں کے حق میں اور کسانوں کے خلاف تھی۔ مسعود کھدر پوش جو ایک سرکاری افسر تھے انہوں نے اس روپورٹ پر اختلافی نوٹ لکھا۔ روپورٹ کو اس اختلافی نوٹ سمیت میل کر دیا گیا۔ سرکاری روپورٹ تو جلد ہی اپنی موت مر گئی لیکن اختلافی نوٹ مسعود کھدر پوش کے نام کے ساتھ آج بھی تاریخ کے اوراق میں زندہ ہے۔ 1953ء میں کیونٹ پارٹی اور انجمن ترقی پسند مصنفین پر پابندی لگادی گئی۔ فیض احمد فیض سمیت کچھ لوگوں پر بغاوت کا مقدمہ (پنڈی سازش) چلا اور انہیں موت کی سزا دی گئی جو چند سال کے بعد ختم کر دی گئی۔ مشرق اور مغربی پاکستان سے تعلق رکھنے والے اقلیتی ارکان نے دیگر پارٹیوں کے ساتھ ابتدائی دس سالوں میں وسٹور ساز اسمبلیوں میں مساوی حقوق کے لئے جدوجہد کی۔ 1949ء کی قرارداد مقاصد سے لے کر 1956ء کے آئین تک انہوں نے اس اہم فورم پر پاکستان کو ایک مذہبی ریاست بنانے، جدا گانہ انتخاب اور ریاستی عہدوں کو مذہب کے اعتبار سے مخصوص کرنے کی پُر زور مخالفت کی۔ 60 کی دہائی بھی حقوق کی خلاف ورزیوں اور سرکاری سطح پر داروں گیر سے عبارت تھی۔ اسی دوران سیاسی اور جمہوری حقوق کی تحریک میں سیاسی پارٹیوں کے علاوہ طلباء، وکلاء، مزدوروں، صحافیوں اور دانشوروں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔

1958ء میں مارشل لاء کے ساتھ ہی سیاسی جماعتوں پر پابندی عائد کر دی گئی تھی لیکن 1962ء میں جزل ایوب نے اپنے آپ کو ایک پارٹی (مسلم لیگ) کے ذریعے صدر منتخب کروانا مناسب سمجھا تو اپوزیشن کی جماعتوں نے محترمہ جناح کو ان کے مقابلوں میں امیدوار بنانے کا اس کی زبردست مزاجمت کی۔ 1956ء میں باہمی بازو کے نظریات کی حامل طلباء تنظیم نیشنل سٹاؤٹس فینڈریشن کراچی یونیورسٹی سے شروع ہوئی تو جناب حسین نقی اور مسراج محمد خان نے اس تنظیم کی تشکیل میں نمایاں کردار ادا کیا جس پر 1958ء اور پھر 1961ء کے دوران پھر پابندی لگادی گئی۔

50 کی دہائی غیر نمائندہ اور غیر جمہوری سوچ کے حامل سیاست دانوں اور بیورو کر لیکی کے گھٹ جوڑ کے نتیجے میں ہونے والی سازشوں اور حکومتوں کی اکھاڑ پچھاڑ کی دہائی کے طور پر یاد کی جاتی ہے۔ 60 کی دہائی پاکستان میں جمہوری اور سیاسی حقوق کی جدوجہد کی دہائی شاہزاد ہوئی لیکن فوجی حکومت نے ایکشن 1970ء کے نتائج کو نہ مان کر حکومت کی رائے کی توپیں کی جس کا نتیجہ جنگ 1971ء اور مشرقی پاکستان کی علیحدگی کی صورت میں نکلا۔ بھٹو صاحب اور پیبلز پارٹی کی مقبولیت دوپاؤں کی مرہون منت تھی ایک وہ کارکن جنہوں نے پیبلز پارٹی کا منشور بنایا تھا اور دوسرے بھٹو کی شخصیت کا مقناطیس۔ لیکن بھٹو حکومت جو کہ پہلی راہ راست منتخب حکومت تھی کوئی بھی قبل قدر کام کرنے میں ناکام رہی۔ نیوکلیئر پروگرام شروع کرنا عسکری سوچ کی کڑی تھی جس نے پاکستان کو مسلسل پسماندہ رکھا ہوا ہے۔ بھٹو صاحب کا کہنا تھا کہ ہمیں گھاس بھی کھانا پڑی تو کھالیں گے لیکن ایتم بم بھی ضرور بنائیں گے۔ ایتم بم بھی ہن چکا اور گھاس بھی کھا رہے ہیں لیکن نہ تو ملک محفوظ ہوا اور نہ ہی عوام کی حالت بدلتی۔ ہاں یہ ضرور ہوا کہ ملک کے اداروں میں عدم استحکام پیدا ہوا۔ آج اگر اختیارات کا جھکاؤ انتظامیہ کی طرف ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ بھٹو دور میں آئینی اداروں کو جس فریم ورک میں لا یا جا سکتا تھا، وہ نہیں لایا گیا۔

1973ء کا آئین بڑا کارنامہ کہا جا سکتا ہے لیکن آئین بنانے کو کارنامہ صرف پاکستان کے سیاق و سبق میں ہی کہا جا سکتا ہے۔ آئین میں وہ تمام مذہبی تعصبات موجود تھے، جن کو استعمال کر کے آئندہ کی حکومتیں اس ملک کو ایک تھیکو کر لی (مذہبی ریاست) میں تبدیل کر سکتی تھیں۔ اس کے علاوہ صوبائی خود مختاری کے سوال پر آئین میں چھوٹے صوبوں کے ساتھ زیادتی ہوئی۔ پیبلز پارٹی کے پہلے دور حکومت (77-1972ء) میں اپوزیشن جماعتوں کے ساتھ بُرا اسلوک کیا گیا۔ چوہدری نلہور الہی پر بھیں چوری کا مقدمہ تو نیشنل عوامی پارٹی پر غداری کا مقدمہ بنا۔ نیشنل عوامی پارٹی پر پابندی لگا کر اس کی قیادت (28 افراد) پر حیر آباد میں ایک ٹریبیول کے ذریعے ناجائز مقدمات قائم ہوئے۔ اپوزیشن کو تحقیک کا نشانہ بنایا گیا۔

ان کے جلسے تک روکے گئے۔ یہاں تک کہ بھٹو صاحب کے چند قریبی ساتھیوں نے بھی علیحدہ ہونے میں عافیت بھی۔ ان میں مختار رانا، ڈاکٹر غلام حسین اور میاں محمود قصوری جیسے نام آتے ہیں۔ معراج محمد خان حبیب جالب کو بھی کارز کر دیا گیا۔ اس دور میں عوام میں ایک سیاسی جوش و خروش پایا جاتا تھا۔ بھٹو صاحب نے اپنی مقبولیت کو دوام دینے کے لئے مذہب کو استعمال کرنا شروع کیا تو پہلے 1974ء میں قومی اسمبلی میں احمدیوں کو غیر مسلم قرار دیا گیا۔ بلکہ اس قرار داد کو آئین کا حصہ بنایا گیا۔ پھر جمعہ کو ہفتہ وار چھٹی مقرر کر دی جس سے جان چھٹروانے میں 30 سے زیادہ سال لگے۔ (1997ء میں نواز شریف حکومت نے اس کو تبدیل کر کے اتوار کی چھٹی مقرر کی)۔ بھٹو حکومت نے سکولوں میں اسلامیات کو لازمی مضمون کے طور پر لا گو کروایا اور شراب پر پابندی عائد کر دی۔ چھٹے موٹے کام سول سو سائٹی کے بھی ہوئے جیسے ٹیلی وژن اور فلم انڈسٹری کی حالت کچھ بہتر ہوئی۔ فیض صاحب پنجاب آرٹ کوسل اور الحمرا بنوانے میں کامیاب ہوئے۔

1980ء کے آتے آتے ضیاء الحق بھٹو کو بھانسی دے چکے تھے۔ افغانستان میں روی فوجیں اور ایران میں آیت اللہ خمینی کا انقلاب آچکا تھا۔ ساری باتوں نے ضیاء الحق کے اقتدار کو مضبوط کر دیا۔ لہذا اس تیسرے مارشل لا کو دوام دینے کے لئے ضیاء الحق نے اسلام کے نام پر متعدد قوانین بنائے جن کا مقصد فوری طور پر سخت سزاوں کا نظام متعارف کروانا اور اپنے اقتدار کو طول دینا تھا۔ ان قوانین پر پہلا احتجاج شیعہ مسلم کے لوگوں کا اسلام آباد میں پارلیمنٹ (1980ء) کا گھیراؤ تھا اور دوسرا 1982ء میں ویکن ایکشن فورم کے نام سے عورتوں کی ایک تنظیم کی طرف سے تھا۔ اہل تشیع کو مختلف سپاہ بنا کر سزا دی گئی تو عورتوں پر فوری طور پر ڈنٹے بر سائے گئے اور جیلوں میں بند کر دیا گیا۔

سیاسی جماعتوں نے مودمنٹ فار ریسٹوریشن آف ڈیموکریسی (ایم آرڈی) کے ذریعے مارشل لا کے خلاف مہم چلانی تو کئی ہزار کارکنوں کو جیلوں میں ڈالا گیا۔ ہزاروں کارکن عقوبات خانوں کے حوالہ کر دیئے گئے اور کئی ہزار صحابیوں، وکیلوں اور سیاسی کارکنوں پر سمری ملٹری عدالتوں میں مقدمے چلا کر سخت سزا میں دی گئیں۔

1983ء میں جب ایم آرڈی کی تحریک زور دوں پر تھی۔ نذر عباسی کو تنہد کر کے ہلاک کیا گیا تو ایا زس موں اور ریاض جھرنا ہیسے کئی لوگوں کو جرائم میں ملوث کر کے پھانسی کی سزا دی گئی۔ ایک طیارہ اغا کروا کے الذوق قارنامی تنظیم کے کھاتے میں ڈالا گیا۔ بھٹو صاحب کے نوجوان بیٹے اس قدر سادہ تھے کہ وہ اس چال کو سمجھ نہ سکے۔ بہر حال عوام نے آنے والے وقت میں پیپلز پارٹی کا بھرپور ساتھ دیا کیوں کہ یہ وہ واحد جماعت تھی جو افسرشاہی کے سامنے کھڑے ہونے کی مقدور بھر کوشش کر پائی۔ ضیاء الحق کا دور شہری اور سیاسی آزادیوں کے لحاظ سے جتنا تاریک تھا۔ اتنے ہی جوش سے اس کے خلاف جدوجہد ہوئی۔ ویکن ایکشن فورم (WAF) کی ممبر ارکان نے حقوق کی مختلف تنظیمیں قائم کیں۔ عورت فاؤنڈیشن، شرکت گاہ، اے جی ایچ ایس (لیگل ایڈیسل) اور دیگر کئی تنظیموں کی بنی ارکان ویکن ایکشن فورم کی رکن تھیں۔

1986ء میں بھٹہ مزدوروں کی تنظیمیں خاص طور پر بالائی پنجاب کے علاقوں میں سرگرم ہوئیں جنہوں نے 1987ء تک ایک تحریک کی شکل اختیار کر لی۔ فیصل آباد اور شیخوپورہ کے علاقوں میں کمپیشن برائے امن و انصاف کے توسط سے بھٹہ مزدوروں کی جبری مشقت، بے دخلی اور اجرت سے انکار پر عدالتوں سے رجوع کیا گیا۔ قصور، لاہور، بھائی پھیر وغیرہ میں باٹلڈ لیبرلریشن فرنٹ (بھٹہ مزدور اتحاد) نے مزدوروں کو منظم کیا، یہ وہی تنظیم ہے جس نے بہت اچھا کام بھی کیا لیکن محض ایک شخص احسان اللہ خان کے محدود ایجنڈا نے اس تنظیم کی شہرت اور قوت کو نقصان پہنچایا۔ اقبال مسحی قتل کیس کے حقائق ممتاز ہوئے تو احسان اللہ کو بیرون ملک پناہ لینا پڑی لیکن ظفریاب احمد کوئی ممینے قید میں رکھ کر ٹارچ کیا گیا۔ جس کے لئے بچوں کی مشقت پر ان کی لکھی ایک روپورٹ کو بہانہ بنایا گیا۔ اس کے باوجود بھٹہ مزدوروں کے حقوق کی تحریک نے چند اہم کامیابیاں حاصل کیں۔

1987ء میں لاہور ہائی کورٹ میں جسٹس افضل ظلہ کا وہ مشہور فیصلہ آیا جس میں عدالت نے بھٹہ مالکان کی طرف سے پیشگی قرضہ (سٹم) کو غیر قانونی قرار دے دیا۔ اس کیس میں محترمہ عاصمہ جہاگیر مزدوروں کی وکالت کی رہی تھیں۔ 1992ء میں پیپلز پارٹی کے

دور حکومت میں اتحاد آر سی پی کی طرف سے تیار کیا گیا جو مشقت کے خاتمے کا ایک بل پاس ہوا۔ 1987ء میں غیر سرکاری پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق کا قیام عمل میں آیا جس سے انسانی حقوق کی جدوجہد کے لئے ایک مضبوط پلیٹ فارم قائم ہو گیا۔ جسٹس دراب پیل، آئی اے رحمن، عاصمہ جہانگیر، عزیز صدیقی، نثار عثمانی، حسین نقی، حنا جیلانی جیسے مخفجے ہوئے انسانی حقوق کے علمبرداروں کی قیادت میں ملک بھر کے بہترین کارکنوں کو مل کر کام کرنے کا موقع مل گیا اور کمیشن نے کئی معاملات میں گراں قدر خدمات انجام دیں۔ جدید خطوط پر حقوق کی سوچ اور سیکولر مقاصد کے لئے پہلی این جی او کا قیام تو ادارہ امن و انصاف (کراچی) کی شکل میں 1974ء میں عمل میں آچکا تھا لیکن اس رحجان کو پچھلنے پھولنے کا موقع 80ء کی دہائی میں ملا۔ 1988ء میں جب شریعت بل پیش ہوا تو انسانی حقوق کے مخالفین کی طرف سے اس کی شدید مخالفت ہوئی۔ 1992ء میں نواز حکومت نے شناختی کارڈ میں مذہب کا خانہ شامل کرنے کا فیصلہ کیا تو ملک گیر مہم چلانی لگی جس کی قیادت قومی کمیشن برائے امن و انصاف نے کی۔

1992ء تک سندھ میں شکیل احمد پٹھان کی کوششوں سے ہاریوں کی جبری مشقت کا مسئلہ سامنے آچکا تھا۔ جس بے جا کی سینکڑوں درخواستوں کے ذریعے ہزاروں مردوزن اور پچھے جو زمینداروں کی غلامی میں پھنسنے ہوئے تھے، ان کو نکالا گیا پھر ان کی آباد کاری و بحالی کا سوال سامنے آیا تو کیتوں کچھ چرچ نے مالتی میں کئی سال تک رہا ہونے والے ہاریوں کو پناہ دی اور ان کی دیکھ بھال میں معاونت کی۔

1994ء میں منظور سعیج کے قتل کے ساتھ تکفیر کے قوانین کے خلاف عوامی سٹھ پر ایک مراجحت کا آغاز ہوا جس کی قیادت بشپ جان جوزف کر رہے تھے۔ اسی سال پاکستان اندیا پیپلز فورم فارپیں اینڈ ڈیموکریسی کا پہلا کنوپیش منعقد ہوا جس کے روح رواں ڈاکٹر مبشر حسن اور آئی اے رحمان تھے۔ یہ دونوں ممالک میں عوام کی سٹھ پر میل ملáp کو باقاعدہ اور منظم طریقے سے تشکیل دینے کی ابتدائی کوشش تھی۔ فورم کا پہلا کنوپیش دہلی میں ہوا پھر سالانہ بنیادوں پر یہ کنوپیشن لگاتار پاکستان اور بھارت میں ہونے لگے۔ حکومتوں کو مشکل صورت حال سے نکالنے اور کشیدگی کے باوجود بات چیت جاری رکھنے کا سہرہ انہی کوششوں کے سر

ہے۔ 1998ء میں کارگل کی مهم جوئی نے دونوں ملکوں کے عوام کو جس مشکل میں ڈال رکھا تھا اس سے چھٹکارا آسان نہ تھا۔ پاک انڈیا فورم کے علاوہ کئی اور تنظیموں پاک بھارت تعلقات کے حوالہ سے خصوصاً کام کر رہی ہیں جن میں ساؤ تھک ایشیا فرٹرینٹی اور ولڈ پنجابی کانفرنس نمایاں ہیں۔ اور دونوں ملکوں کی عوامی تنظیموں کی کثیر تعداد اس مقصد کے لئے سرگرم عمل ہے۔

2000ء اور 2001ء میں جدا گانہ طرزِ انتخاب کے خاتمے سے متعلق ایک کامیاب

مہم چلانی گئی۔ قومی کمیشن برائے امن و انصاف کی قیادت میں درجنوں تنظیموں نے اس مہم میں حصہ لیا۔ جس میں سینکڑوں سیمینارز کے ذریعے عوامی رابطہ، سختی مہم اور اقوام متعدد کے طریقہ کار 1503 کے ذریعے حکومت سے گذارش شامل ہیں۔ عورت فاؤنڈیشن کی قیادت میں عورتوں کے لئے سیاسی اداروں میں نمائندگی کے لئے بھی پروزور مہم چلانی گئی جس کو 2000ء کے بلدیاتی انتخاب میں کامیابی ہوئی۔ اور پھر 2002ء کے عام انتخابات میں عورتوں کے لئے مخصوص نشستیں رکھی گئیں۔ ایک تحریک اواکاڑہ میں مزارعین کے ماکانہ حقوق سے متعلق 2001ء میں چلانی گئی۔ اس تحریک نے ملٹری فارمز کے ہزاروں مزارعین میں حقوق کا شعور پیدا کیا۔ نیز ملٹری فارمز پر انتظامیہ کے ناجائز مطالبات سے جان چھڑواری لیکن اس تحریک کو مقدموں، گرفتاریوں اور محاصروں کے ذریعے سختی سے کچلا گیا۔ اس تحریک کو بین الاقوامی ذرائع ابلاغ میں جگہ ملنے کے بعد انتظامیہ کا جبر کچھ کم ہوا لیکن زمین کے حقوق ملکیت کا معاملہ بھی حل طلب ہے۔

دانشوروں اور فنکاروں نے ثقافتی محاذ پر بے مثال کام کئے۔ سڑیٹ تھیٹ کے حوالہ سے کراچی میں اسلام اظہر کی قیادت میں گروپ دستک اور شیما کرمانی کی تحریک نسوان، لاہور میں شاہد ندیم اور مدیحہ گوہر کی قیادت میں اجوکا تھیٹ نے انتہائی اعلیٰ معیار کے ڈرائے تحلیق کر کے تبادل راستوں کی نشاندہی کا سلسلہ جاری رکھا۔

انسانی حقوق کی تحریکیوں میں ایک اضافہ جدید طرز پر کام کرنے والی این جی او ز کا ہوا، ان کے کام پر مختلف آراء پائی جاتی ہیں۔ زیر بحث موضوع میں تو صرف ان تنظیموں کے حوالہ سے بات کی جاسکتی ہے جو فلاجی اور ترقیاتی سوچ کی بجائے حقوق کی وکالت (ایڈوکسی) کا کام

کرتی ہیں۔ جائزہ میں ایسی تنظیموں کو شامل نہیں کیا گیا جو کسی سرکاری اعانت کے ساتھ یا سرکار کے اشتراک سے منصوبوں پر عمل درآمد کرتی ہیں۔ اس تفریق کی وجہ پاکستان کے معروضی حالات ہیں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ این جی او ز کو بھی بھی سرکار کے اشتراک سے کام نہیں کرنا چاہیے۔ ایسا کئی ملکوں میں ہوتا ہے۔

ایک سوال یہ اٹھایا جاتا ہے کہ این جی او ز نے اپنے خاصے انسانی وسائل اپنی طرف گھینچ کر سیاسی جماعتوں کو ممنوع کر دیا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے، سیاسی جماعتیں اپنے آپ کو مضبوط کریں، اپنے طور طریقے ٹھیک کر کے لوگوں کو دعوت دیں، لوگ آجائیں گے۔ اس کے علاوہ کچھ تنظیموں انسانی حقوق کے حوالہ سے تعلیم و تربیت، تجویز و تحقیق اور انتخابات کی نگرانی اور جائزے مرتب کرنے کا کام بھی کر رہی ہیں جسے غیر سیاسی تو نہیں کہا جا سکتا البتہ ان کے اور سیاسی جماعتوں کے طریقہ کار میں فرق ہے اور رہنا بھی چاہیے۔

بالخصوص 2005ء سے 2015ء تک دہشت گردی کے واقعات نے ملک کے اندر سماجی عوامل کو عملاً مفلوج کر رکھا تھا۔ سماجی اور فکری توانائی کے حامل لوگوں نے اس کی کوڈرائے ابلاغ اور سوشنل میڈیا کے ذریعے پورا کرنے کی کوشش کی مگر سکیورٹی خدشات کے عندر پر ایک نئی طرح کی سنسرشپ لگا دی گئی۔ ریاست کے مخالف شدت پسند گروہوں نے سول سوسائٹی کے فعال کارکنوں کو نشانہ بنایا جو جمہوریت، جدیدیت اور انسانی حقوق کا ہر اول دستہ تھے۔ مذہب، فرقہ اور مغربی سوچ کے الزامات لگا کر سرگرم کارکنوں کی زندگی مشکل بنا دی گئی۔ 2011ء میں گورنر سلمان تاشیر اور وفاقی وزیر شہباز بھٹی کے قتل کے دو اہداف تھے۔ پہلا اہانت دین کے قانون کی آڑ میں انہی نفرت کو مزید ہوا دینا اور دوسرا سماجی ترقی اور تبدیلی کی سوچ رکھنے والے سرکاری اور غیر سرکاری فعال کارکنوں کو دھمکانا۔

2011ء ہی میں زرطیف خان آفریدی کو فاتا میں قتل کیا گیا۔ 2013ء میں ماہر ترقیات پروین رحمان کو کراچی میں اور 2014ء میں راشد رحمان ایڈو و کیٹ کو ملتان میں قتل کر دیا گیا سین محمود 2015ء میں کراچی میں گولیوں کا نشانہ بنی۔ صحافی اور دانشور رضا رومنی 2014ء میں لاہور میں قاتلانہ حملہ میں بچ گئے لیکن ملک چھوڑنا پڑا۔ لیکن سینکڑوں وکلاء صحافی اور انسانی حقوق کے

کارکن اس غیر اعلانیہ جنگ نے چھین لئے۔ یہ صرف چند مثالیں ہیں جنکی آوازیں خاموش کرنا اُن طاقتوں نے ضروری سمجھا جو پاکستان کوتاری کی اور لا قانونیت کی دلدل میں پھینک کر اس کے مختلف علاقوں کو نظرول کر رہے تھے۔

2015ء میں دُنیا بھر میں عزت کی نگاہ سے دیکھی جانے والی تنظیم (Save the Children) کے دفتر کو بند کرنے میں وہ لوگ ملوث تھے جو بیٹھے تو سرکار کے اندر ہیں لیکن ریاستی پالیسیوں کو من مرضی سے اور دُنیا کے معاملات سے آگھیں بند کر کے چلانے پر مُصر رہتے ہیں۔ اس بلا جواز اقدام اور بین الاقوامی اخلاقی دباؤ کے باعث چند ماہ بعد اس تنظیم کا دفتر تو کھولنا پڑا لیکن اس ناکامی کے ذمہ دار افسران نے کارروائی کا رُخ مقامی این جی اوز کی طرف موڑ دیا۔ 2016-17ء میں کئی غیر سرکاری تنظیموں کو کام سے روکنے کی کوشش کی گئی بعد ازاں اُن تنظیموں کو اعلیٰ عدالتون نے کام کرنے کی اجازت دی جن کے دفتر بند کیے گئے تھے نیز حکومتی کاروانیوں کو موارائے قانون قرار دیا۔ دفتر تو کھلے مگر تنظیموں کے راستہ میں انتظامی مشکلات کھڑی کر دی گئیں۔

2017ء میں فٹا، بلوچستان اور جنوبی پنجاب میں عملاً نصف پاکستان میں این جی اوز کام نہیں کر سکتیں جس کا براہ راست اثر قدرتی آفات، غُربت وغیرہ سے متاثرہ گروہوں کی زندگیوں پر پڑتا ہے۔ حقوق پر کام کرنے والی تنظیموں کا ناطقہ بند کرنے کا براہ راست اثر یہ ہوتا ہے کہ پسے ہوئے طبقات کے مفادات پس پُشت چلے جاتے ہیں۔ محروم طبقات مثلًاً بچے، کسان، عورتوں کے حقوق پر عوامی مگر انی کا نظام اور سماجی و اخلاقی دباؤ کمزور ہو جاتا ہے۔

2017ء میں سول سوسائٹی بھی ریاستِ پاکستان کی طرح 70 سالہ تحریک رکھتی ہے جس کی اپنی تو نانیاں اور کمزوریاں ہیں جیسے ہر ادارہ اور سماج کی ہوتی ہیں۔ اس وقت سوال یہ ہے کہ آیا سول سوسائٹی کے لیے مطلوبہ جگہ اور شہری آزادیوں (اظہار، انجمن سازی، اجتماع) کے بغیر ایسے پاکستان کا نصیر کیا جاسکتا ہے جو جمہوری نظام، ترقی یافتہ معاشرت اور سماجی ہم آہنگی سے آشنا ہو۔ توقع یہ ہے کہ ایسا ممکن ہوگا کیونکہ پاکستان کے عوامی مزاج میں یہ ٹوپی بھی شامل ہے کہ یہاں

نا انسانی کے خلاف آوازیں اٹھتی ہیں، زرخیز ڈھنوں کی کمی نہیں۔ ایک زندہ قوم مکالمے، حقوق کا احترام اور برداشت کو استعمال میں لے آئے تو تمہیر نو کے امکانات روشن رہتے ہیں۔

حاصل گفتگو

پاکستان میں انسانی حقوق کی تحریکیں مختلف اوقات اور مختلف ایشوز پر چلتی رہی ہیں لیکن بعض تحریکیوں میں ایک متبادل نظام کی سوچ اور منصوبے بھی شامل تھے لیکن ایشوز پر تحریکیں چلانا مخصوص حالات میں درست حکمت علمی ثابت ہوئی۔

انسانی حقوق کی تنظیموں کا اکیلے کوئی تحریک بننا مشکل ہوتا ہے۔ پاکستان میں عوامی تنظیموں نے اکثر و بیشتر ایشوز کے حوالے سے الحاق اور اتحاد بنا کر کام کیا ہے جس میں عوامی تنظیموں کے سبھی شعبوں کی نمائندگی شامل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ ان تنظیموں کو کیا کیا کرنا اور کس کس چیز سے بچنا چاہیے ان کی لمبی فہرست بن سکتی ہے البتہ مندرجہ ذیل باتوں کی اشد ضرورت محسوس کی جائی ہے۔

1۔ عوام میں انسانی حقوق کے حوالہ سے معلومات کا تبادلہ اور بحث مباحثہ اور نئے خیالات اور امکانات تلاش کرنا، ایک طرف تو اس مایوسی سے چھکارا دلاستا ہے جو پاکستان کے عوام میں پھیل بچی ہے۔ دوسرے عوامی رابطوں سے حقوق کے لئے کام کرنے والی تنظیموں کے دائرہ اثر میں اضافہ ضروری ہے۔

2۔ انسانی حقوق کی تحریکیں تازہ تجربے کی قوت اور مدد سے آگے بڑھتی ہیں۔ تحریک آزادی اور سرد جنگ کے زمانے کے تجربے غیر موزوں ہو چکے ہیں۔ موضوعات کے حوالہ سے کھلے پن کے ساتھ مکالمے کے لئے تیار رہنا چاہیے۔

3۔ کوئی بھی نظریہ جو نفرت کو تجزیہ اور لائحہ عمل کی بنیاد بنتا ہے وہ خطرناک اور ناقابل عمل ہے۔ اس لئے رنگ و نسل، مذہب، قومیت یا طبقات کسی بھی بنیاد پر انسانوں میں تقسیم ہکراو اور نفرت کی آپشن رکھنے والا کوئی بھی سیاسی عمل یا تصور انسانی حقوق کی سوچ سے لگانیں کھاتا۔

4۔ جائز مقصد کے ساتھ ذرائع کا جائز ہونا ضروری ہے۔ پاکستانی معاشرہ جس نجح پر کھڑا ہے۔ اس میں اپنے تسلیم کردہ اخلاقی معیارات پر پورا اتنا اور روول ماؤں بنانا ضروری ہے۔

کلیسا اور انسانی حقوق

2017 میں دنیا کی تقریباً 7 ارب آبادی میں تقریباً 2.3 ارب مسیحی (31 فیصد)،

1.8 ارب مسلمان (24 فیصد)، 1.1 ارب ہندو مت (15 فیصد)، 50 کروڑ بدھ مت (7 فیصد)، 3 کروڑ سکھ مت، 1.4 کروڑ یہودی، بہائی تقریباً 70 لاکھ، زرتشتی مذہب 26 لاکھ اور شینو موت عقائد سے 40 لاکھ افراد تعلق رکھتے ہیں اس کے علاوہ دنیا کی 16 فیصد آبادی یا 2.1 ارب انسانوں کا کوئی مذہب نہیں ہے، اس کے علاوہ اور بھی عقائد ہیں۔ بعض مذاہب میں ایک مرکزی اخباری کا تصور اور ڈھانچہ موجود ہے تو کوئی مذاہب میں اس کو مناسب خیال نہیں کیا جاتا۔ کہیں الہام کا تصور ہے تو کہیں پر نہیں ہے۔ عقائد سب کو عزیز ہوتے ہیں۔ انسانی حقوق کے حوالہ سے دلچسپی یہ ہوگی کہ کسی مذاہب کے پیروکاروں نے انسانوں کی مذہبی انفرادیت کو کتنا تسلیم کیا، بحیثیت انسان ان کے حقوق کا لکنا احترام کیا۔

انڈونیشیا کے سابق صدر عبدالرحمن واحد، محترم دلائی لامہ اور بشپ ڈیسمینڈ ٹولٹو جیسی کئی معتبر مذہبی شخصیات نے اپنی مذہبی حیثیت میں انسانی حقوق کی وکالت کی، باوجود کہ ہر مذہب کے پیروکاروں کی خدمات کا انسانی حقوق کے حوالہ سے مطالعہ کرنا ایک دلچسپ مشق ہو سکتی ہے مگر فی الحال اس بات کو تسلیم کرتے ہوئے کہ انسانی حقوق کے ارتقا میں سب مذہبی تحریبات اور تصورات سے استفادہ کیا گیا ہے۔ دوسرے باب میں ہم کلیسا کے موقف کا تقدیری جائزہ لے چکے ہیں، آئیے مسیحی جماعت کے اندر انسانی حقوق کے حوالہ سے سوچ کا طائرانہ جائزہ لیتے ہیں۔

دنیا کی کل مسیحی آبادی کا تقریباً نصف تو تیسرا دنیا کے ممالک میں ہے نیز 1.28 ارب آبادی کا تعلق کا تحولک فرقہ سے ہے باقی انگلیکن، لوگران اور آرٹھوڈکس قابل ذکر فرقے ہیں۔

جہاں تک فرقوں اور ذیلی جماعتوں کا تعلق ہے۔ ان کی تعداد ہزاروں میں ہے بلکہ کئی لحاظ سے فرقے کی بجائے ان کو مقامی کلیسیائیں کہا جائے تو مناسب ہوگا۔ پروٹسٹنٹ (لوثرن اور دیگر) فرقوں کا ایک بڑا الحاق عالمی سطح پر درلڈ کو نسل آف چرچ ہے جس کا صدر دفتر جنیوا میں ہے۔ یہ ادارہ انسانی فلاح کے کاموں اور بلا امتیاز انسانی برادری کے حوالہ سے قابل قدر خدمات سر انجام دے رہا ہے۔

کاتھولک کلیسیا کے سربراہ پاپا یعنی عظیم (پوپ) کہلاتے اور ویٹی کن سٹی میں قیام کرتے ہیں۔ عقائد کی تشریع اور سماجی مسائل پر پاپا یعنی عظیم کا اثر اچھا خاصا ہوتا ہے۔ ماضی میں یہ رسوخ سیاسی معاملات میں بھی ہوتا تھا۔ مغرب میں کلیسیا کو ریاستی اقتدار سے باہر رکھنے کی جگہ ہوئی تو پوپ کے ریاستی اختیارات ماضی کا حصہ بن گئے۔ آپ نے انسانی حقوق سے متعلق اہم واقعات میں پڑھا کہ میکنا کارٹا پاس کرنے کے وقت کلیسیا (پوپ) نے اس دستاویز کی کس قدر مخالفت کی۔ سماجی پسمندگی اور مذہبی فکر کی پسمندگی دونوں کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ جہاں علوم و فنون جمود کا شکار ہوں گے مذہبی تک نظری کے ساتھ مذہبی اداروں کا جبکہ شرمناک واقعات کا سبب بن جاتا ہے۔ ساحر لدھیانوی نے درست کہا ہے۔

جہل زندہ ہے تو رسوای ہی رہے گی تہذیب

بھوک زندہ ہے تو بکتے ہی رہیں گے اجسام

ریاست کے معاملات میں مذہبی پیشواؤں کی مداخلت کا سلسلہ جس وقت ختم ہوا تو احیا علوم کا دور رoshn کی طرح دستک دے رہا تھا۔ یورپ کے اپنے ’تاریک دوز سے نکلنے میں اس کشمکش کا بڑا حصہ ہے پھر انقلاب فرانس (1789ء) جیسے واقعات میں مذہبی قیادت کے غم و غصہ نے شدت اختیار کی تو مذہبی قیادت تشدد اور قفال کا نشانہ بنی۔

پروٹسٹنٹ فرقے چونکہ ایک مرکزی دھارے سے نکلنے والی شاخیں تھیں۔ ان میں ابتداً فکری تنوع اور روشن خیالی کا ہونا فطری امر تھا۔ کاتھولک کلیسیا میں بھی تئی سماجی فکر نے انگرائی لی۔ پوپ صاحبان کی طرف سے مختلف دستاویزات جاری کی گئیں جنہیں پاپائی دستاویزات (Encyclicals) کہا جاتا ہے۔ ان دستاویزات سے مسیحیوں میں مباحثت اور

نئے خیالات کے لیے گنجائش بنی جنمیں، کلیسا کی سماجی تعلیمات، کہا جاتا ہے۔

پوپ لیو تیرھویں نے 1878ء، 1881ء، 1885ء میں تین دستاویزات جاری کیں۔ یاد رہے کہ انقلاب فرانس کو ایک سو سال گزر چکے تھے اور چارلس ڈارون کے نظریہ ارتقا کو تقریباً 30 سال گزرے تھے۔ لہذا ان تینوں دستاویزات میں نئی سوچ کے ساتھ پرانے مذہبی تصورات کا دفاع کیا گیا تھا لیکن پوپ لیونے ہی 1891ء میں ایک دستاویز جاری کی جو کلیسا کی سوچ میں تبدیلی کا سنگ میل بن گئی، دستاویز کو Rerum Novarum یا 'نئی حکمیت' کہا گیا۔ اس دستاویز میں نجی جانبیاد کے حق کی حمایت کے ساتھ ساتھ مزدوروں کے حقوق، مزدور یوتین اور مناسب اجرت کی وکالت شامل تھی۔ پوپ نے اس دستاویز میں سماجی ناصافی پر کھل کر تنقید کی۔ یاد رہے کہ اس وقت کارل مارکس اور اینگلز کے اشتراکی منتشر کو آئے 33 سال ہو چکے تھے اور روس کا انقلاب صرف 25 سال کے فاصلے پر تھا۔ اس دستاویز کے بعد کئی دستاویزات اس کے اتباع میں آئیں یہاں تک کہ پوپ جان تینسویں نے (1963ء) Pacem In Terris یا 'زمین پر امن' کے عنوان سے پاپائی دستاویز جاری کی۔ عالمی امن، قومی آزادی، عورتوں کے حقوق، انسانی وقار کی بحالی کے لیے کاتھولک اور مسیحی مونین سے استدعا کی گئی تھی۔ اقوام متحده کے قیام اور نوآبادیات کے خاتمے نے فضا کو ہموار کر دیا تھا اور وسیع اور عالمگیر موقف اپنا آسان ہو گیا تھا 1962ء سے 1965ء تک جاری رہنے والی ویٹی کن کونسل دوئم نے تو گویا پانسہ پلٹ دیا۔ ویٹی کن کونسل اجتہاد کی صورت تھی جس میں دنیا بھر سے کاتھولک علاوہ پیشووروم میں عقائد اور تعلیمات پر عصری تقاضوں کے مطابق بحث و مباحثے کے ذریعے جن متنات پر پہنچے، ان کو دستاویزی شکل دے دی گئی۔ اس کونسل نے بہت سے اقدامات کے ذریعے کاتھولک مونین کے لیے روشن خیالی کے امکان پیدا کیے، اس میں دیگر مذاہب کے ساتھ جل کر انسانیت کی بھلانی کے لیے مربوط کام کرنا بھی شامل تھا۔ خاص طور پر اسلام، ہندو مت اور بدھ مت کے بارے میں کونسل کی دستاویزات میں بڑے واضح اور ثابت موقف کا اظہار کیا گیا۔ دنیا بھر کے کاتھولک مسیحی جوتب تک لاطینی زبان میں دعا کرتے تھے، ان کو مذہبی رسومات کے لیے اپنی مقامی زبان استعمال کرنے کی

اجازت مل گئی۔ باہل مقدس کے تراجم اور تفسیر کے حوالہ سے بھی لبرل خیالات سامنے آئے۔ پوپ جان پال دوئم نے تیرے ہزاریے کے آغاز پر ایک بڑی مذہبی جماعت کے سربراہ کے طور پر اقوام عالم خاص طور پر یہودیوں اور مسلمانوں سے معافی مانگی، انہوں نے ماضی کی کلیسا کی کچھ فہمیوں اور اہل علم کے ساتھ ہونے والی زیادتوں پر معافی مانگی۔ پوپ جان پال دوئم نے اس کے علاوہ کئی شاندار روایات قائم کیں۔ اپنے اوپر قاتلانہ حملہ کرنے والے محمد آغا کو معاف کرنے کے علاوہ مساجد کی زیارت اور روم (ائلی) میں ایک عظیم الشان مسجد بنانے میں اعانت بین المذاہب ہم آہنگی کے ان کے اقدامات کی روشن مثال بنی۔ کئی حوالہ سے کاتھولک کلیسا کا موقف اب بھی سخت ہے مثلاً عورتوں کی امامت یا پادری بننے کے امکان، خاندانی منصوبہ بندی، استقاطِ حمل، پادری کا شادی شدہ ہونا۔ اس پر جماعت کے اندر اور باہر سے تقیدی کی جاتی ہے۔ کاتھولک کلیسا کا موقف کہیں کہیں سماجی سوچ سے ٹکراتا ہے لیکن انسانی حقوق کے مسلمہ امور اور اقدار پر کلیسا نہ صرف حمایت کرتی بلکہ ان کی پروجش و کیل ہے۔ حال ہی میں بین الاقوامی سطح پر چلنے والی مختلف تحریکوں میں کلیسیائی تنظیموں نے بڑے پر جوش طریقہ سے حصہ لیا، ان میں امریکہ اور جنوبی افریقہ میں نسلی امتیاز کے خلاف تحریک، تیسری دنیا کے ملکوں پر غیر ملکی قرضوں کی معافی کی تحریک (جو بلی مہم) اور لذتوش فورم کی تحریک جس کی قیادت میں ہر سطح پر کلیسیائی تنظیموں خصوصاً جمیں اینڈ پیس کمشنز نے بہت فعال کردار ادا کیا ہے۔ افریقہ، امریکہ، یورپ، لاطینی امریکہ اور ایشیا میں جنگ مخالف تحریکوں میں کارکنوں کی ایک خاطر خواہ تعداد کلیسیائی تنظیموں سے تعلق رکھتی ہے جو اس بات کی دلیل ہے کہ مذہبی فکر معاشرے کے رہجان کو متاثر کرتی ہے دوسری طرف ان سے اثرات بھی قبول کرتی ہے۔

انسانی حقوق کا آفاقت اسلامی منشور

پندرہویں صدی ہجری کے آغاز پر 21 ذی قعدہ 1401ھ برابق 19 ستمبر 1981ء کو پیرس میں مسلم علماء اور سکالرز کی اسلامک کونسل نے اسلامی آفاقت انسانی حقوق کے منشور کی منظوری دی۔ پاکستان میں سینٹ کے رکن جناب مجھی بختیار نے اس منشور کو قانون کے طور پر منظور کرنے کے لیے 1991ء میں سینٹ میں پیش کیا لیکن بل پر کسی بحث کی نوبت نہیں آئی۔ اس منشور یا اعلامیہ پر اس کے آفاقت یا اسلامی ہونے پر بحث تو کیا ہوتی اکثر ممالک میں لوگوں کو یہ خبر بھی نہیں کہ ایسی کوئی دستاویز تیار ہو چکی ہے۔ اس کے پیچھے کیا عوامل ہیں آئیے اس منشور کے متن سے سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس منشور کا انگلش متن اس ویب سائٹ پر ملاحظہ کریں۔ www.alhewar.com

آغاز

بنیادی انسانی حقوق کا یہ منشور چونکہ اللہ کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت سے اخذ کیا گیا ہے جن میں حکمران، اسلامیاں اور ادارے نہ تو کمی یا اضافہ کر سکتے ہیں اور نہ ہی انہیں منسوخ یا ان سے صرف نظر کر سکتے ہیں، اور نہ کسی کو ان سے محروم کر سکتے ہیں۔ ان قابل احترام اورنا قابل انتقال حقوق کے منشور کا ترجمہ درج ذیل ہے۔

-1 زندگی کا حق

(الف) انسانی زندگی مقدس اور قابل احترام ہے، اس کی حفاظت کے لیے ہر ممکن کوشش کی جائے گی۔ نہ کسی کو ضرب لگائی جائے گی اور نہ زندگی سے محروم کیا جائے گا، مساوائے قانونی اختیار کے تحت۔

(ب) ایک انسان کا جسم جس طرح اس کی زندگی کے دوران قابل احترام ہے، اسی طرح موت کے بعد بھی واجب الاحترام ہے، لہذا ہر حالت میں انسانی جسم کا احترام کیا جائے گا۔ اہل ایمان کا فرض ہے کہ انسانی نعش کا احترام اور وقار یقینی بنائیں۔

آزادی کا حق -2

(الف) انسان آزاد پیدا ہوتا ہے۔ مساوئے قانونی احکام اور طریق کار کے تحت اس کے حق آزادی پر پابندیاں نہیں لگائی جاسکتیں۔

(ب) نوع انسانی کے ہر فرد اور ہر گروہ یا قوم کو ہر طرح کی ناقابل انتقال حق آزادی حاصل ہے۔ جسمانی، تمدنی، معاشی اور سیاسی اگر اسے آزادی کے حق سے یا اس کے کسی حصے سے محروم کیا جائے، تو وہ حق رکھتا ہے کہ اپنی آزادی کے حق کو حاصل کرنے کے لیے جدوجہد کرے، ان تمام ذرائع کے ساتھ جو اسے حاصل ہیں اور آزادی سے محروم ہر فرد، قوم یا گروہ کے لیے جائز ہے کہ وہ اپنی جدوجہد آزادی میں دوسرے افراد اور اقوام سے مدد حاصل کرے۔

مساویات اور ممنوعہ امتیازی سلوک سے تحفظ کا حق -3

(الف) تمام افراد قانون کی نظر میں برابر ہیں اور یکساں موقع اور قانونی تحفظ کا حق رکھتے ہیں۔

(ب) تمام افراد کو یکساں کام کا یکساں معاوضہ دیا جائے گا۔

(ج) مذہبی عقیدے، رنگ، جنس یا زبان کی بنیاد پر کسی فرد کو کام کے موقع سے محروم نہیں کیا جائے گا کیسی قسم کے امتیازی سلوک کا نشانہ نہیں بنایا جائے گا یا اس سے زیادہ کسی جسمانی خطرے سے دوچار نہیں کیا جائے گا۔

انصاف کا حق -4

(الف) ہر فرد کا حق ہے کہ اس کے ساتھ قانون اور صرف قانون کے مطابق سلوک کیا جائے۔

(ب) ہر فرد کا نہ صرف حق بلکہ ذمہ داری ہے کہ نا انصافی کے خلاف احتجاج کرے،

- قانون کے تحت ازالے کے میسر ذرائع سے، اگر اسے بلا جواز اور بلا اختیار رکھی کیا جائے یا ذاتی نقصان پہنچایا جائے۔ کسی دوسرے فرد یا سرکاری حکام کے ساتھ کسی تنازعے میں یا اپنے خلاف لگائے گئے الزامات کی صورت میں ایک آزاد عدالتی ٹریبوٹ کے ذریعے منصفانہ قانونی کارروائی کے مطابق اپنادفاع کرے۔
- (ج) ہر فرد کا حق اور فرض ہے کہ کسی دوسرے فرد یا برادری کے حقوق کا دفاع کرے۔
- (حہب) ذاتی یا عوامی حقوق کا دفاع کرنے والے کسی فرد کے ساتھ امتیازی سلوک نہیں کیا جائے گا۔
- (ہ) یہ ہر مسلمان کا حق اور فرض ہے کہ کسی ایسے حکم کو ماننے سے انکار کر دے جو قانون کے خلاف ہو، خواہ وہ کسی کی طرف سے بھی جاری کیا گیا ہو۔
- منصفانہ ساعت کا حق
- 5- (اف) کسی بھی فرد کو کسی الزام (شک) کی بنا پر سزا نہیں دی جائے گی، سوائے ایسی صورت کے کہ اس کے جرم کے ثبوت ایک آزاد عدالت کے سامنے پیش کیے گئے ہوں۔
- (ب) مگر ایک منصفانہ ساعت کے بعد جس میں اسے اپنے دفاع کا مناسب موقع دیا گیا ہو، کسی فرد کو قصور و اقرار نہیں دیا جائے گا۔
- (ج) سزا قانون کے مطابق سنائی جائے گی، اس میں جرم کی شدت اور نوعیت کا خیال رکھا جائے گا، اور ان حالات کا بھی جن میں جرم کا ارتکاب کیا گیا تھا۔
- (د) کسی بھی فعل کو جرم نہیں سمجھا جائے گا جب تک اسے واضح لفظوں میں قانون کے اندر بیان نہ کیا گیا ہو۔
- (ہ) ہر فرد اپنے عمل کا خود ذمہ دار ہے۔ ایک فرد کے جرم کی ذمہ داری مفروضہ کے طور پر کسی کے خاندان کے افراد پر یا گروہ پر نہیں ڈالی جاسکتی جو براہ راست یا بالواسطہ جرم کے ارتکاب میں ملوث نہیں ہے۔

6۔ اختیارات کے غلط استعمال سے تحفظ

ہر شخص کو سرکاری اداروں کی طرف سے ہر اسال کیے جانے کے خلاف تحفظ کا حق حاصل ہے۔ وہ اپنے بارے میں کسی جوابدی کا ذمہ دار نہیں، مساوئے اپنے خلاف لگائے گئے الزامات کا دفاع کرنے کے یا ایسی صورت کے جہاں اس کے خلاف کسی جرم میں ملوث ہونے کا شہبہ معقول پایا جاتا ہو۔

7۔ اذیت رسانی کے خلاف تحفظ کا حق

کسی فرد کو ہنسی یا جسمانی اذیت یا تذلیل کا نشانہ نہیں بنایا جائے گا یا خود اسے یا اس کے کسی رشتہ دار یا قریبی شخص کو خوفزدہ کرنے اور دھمکانے کے لئے زخمی نہیں کیا جائے گا، طاقت اور جبر سے کسی جرم کا اعتراف کرنے پر مجبور نہیں کیا جائے گا، نہ ہی کسی ایسے اقدام کی رضامندی پر مجبور کیا جائے گا جو اس کے مفادات کے خلاف ہو۔

8۔ عزت اور شہرت کے تحفظ کا حق

ہر فرد کو اپنی عزت اور شہرت کے خلاف، بہتان کے خلاف، بے بنیاد الزامات یا بدنام اور بلیک میل کرنے کی دانستہ کوششوں کے خلاف تحفظ کا حق حاصل ہے۔

9۔ پناہ حاصل کرنے کا حق

(الف) ہر ستم رسیدہ، مجبور اور ستائے فرد کو پناہ ڈھونڈنے اور حاصل کرنے کا حق ہے۔ یہ حق ہر انسان کو حاصل ہے، نسل، مذهب، رنگ اور جنس کے امتیاز اور استثنائے بغیر۔

(ب) مکہ میں مسجد الحرام (خانہ کعبہ) تمام مسلمانوں کے لئے پناہ گاہ ہے۔

10۔ اقلیتوں کے حقوق

(الف) قرآنی اصول کہ نمہب میں کوئی جرنبیں، اقلیتوں کے مذہبی حقوق کا تحفظ کیا جائے گا۔

(ب) ایک مسلم ملک میں مذہبی اقلیتوں کو اس انتخاب کا حق حاصل ہو گا کہ وہ اپنے دیوانی (سول) اور ذاتی (پرنسل) معاملات میں اسلامی قانون یا خود اپنے قوانین کا انتخاب کریں۔

11- ریاستی امور میں شرکت کا حق اور ذمہ داری

- (الف) قانون کے تحت مسلم برادری (امت) کا ہر فرد سرکاری عہدہ (پلک آفس) حاصل کرنے کا حق رکھتا ہے۔
- (ب) حکومت اور عوام کے درمیان انتظامی تعلقات کی بنیاد آزادانہ مشاورت (شوریٰ) پر استوار ہوگی۔ اس اصول کے تحت عوام کو اپنے حکمرانوں کو منتخب کرنے اور برطرف کرنے کا حق ہوگا۔

12- عقیدہ، فکر اور اظہار رائے کی آزادی کا حق

- (الف) قانون کی طے کردہ حدود کے اندر ہر فرد کو حق ہے کہ وہ اپنے عقائد اور افکار و خیالات کا اظہار کرے۔ تاہم کسی کو یہ حق نہیں کہ وہ جھوٹ پھیلائے یا ایسی اطلاعات کی تشهیر کرے جن سے عوام میں ناشائستگی کو فروغ حاصل ہو، یا دوسرے افراد کے بارے میں بہتان طرازی پر منی یا شہرت کو نقصان پہنچانے والے الزامات لگائے۔
- (ب) سچائی تک پہنچنے کے لیے علم اور سچائی کی ملاش کی کوشش ہر مسلمان کا حق بلکہ فرض ہے۔
- (ج) یہ ہر مسلمان کا حق اور فرض ہے کہ قانون کی حدود میں رہنے ہوئے جبرا کے خلاف احتجاج اور جدو جہد کرے خواہ اس میں حکمرانوں کو چینچ کرنا پڑے۔
- (د) معلومات کے تبادلے پر کوئی پابندی نہیں ہوگی بشرطیکہ ان سے معاشرے یا ریاست کی سیکورٹی کو کوئی خطرہ نہ ہو اور یہ قانون کی طے کردہ حدود کے تابع ہو۔
- (ه) کسی کو یہ حق نہیں ہوگا کہ وہ دوسروں کے مذہبی عقائد کی توہین کرے یا مذاق اور تمثیل کا نشانہ بنائے یا ان کے خلاف عوام میں دشمنی کو فروغ دے۔ دوسروں کے مذہبی جذبات و احساسات کا احترام کرنا ہر مسلمان کی ذمہ داری ہے۔

13۔ مذہب کی آزادی

ہر شخص کو یہ حق ہے کہ وہ اپنے ضمیر اور مذہبی عقائد کے مطابق آزادی سے عبادت کرے۔
14۔ آزادانہ تنظیم بنانے کا حق

(الف) ہر فرد کو حق ہے کہ وہ اپنی برادری کی مذہبی، سماجی، تمدنی اور سیاسی سرگرمیوں میں انفرادی اور اجتماعی طور پر شرکت کرے اور ایسے ادارے اور تنظیمیں قائم کرے جن کا مقصد صحیح اور درست (معروف) کو پھیلانا اور جو کچھ غلط ہے (منکر) اس کو روکنا ہو۔

(ب) ہر فرد کو حق ہے کہ ایسے ادارے قائم کرنے کے لئے جدوجہد کرے جن کا مقصد ان حقوق کے حصول کو ممکن بنانا ہو۔ ایسے حالات پیدا کرنا معاشرے کی اجتماعی ذمہ داری ہے جن میں افراد کی شخصیت کی تکمیل اور بھرپور ترقی ممکن ہو سکے۔

15۔ معاشی نظام اور اس سے حاصل ہونے والے حقوق

(الف) تمام افراد معاشی تگ و دو اور فطرت کے تمام وسائل سے فائدہ اٹھانے کے حق دار ہیں۔

اللہ کی عطا کردہ یہ نعمتیں اور برکتیں پوری نوع انسانی کے لئے ہیں۔

(ب) تمام انسان قانون کے مطابق روزی کمانے کا حق رکھتے ہیں۔

(ج) ہر فرد انفرادی طور پر یا دوسروں کے ساتھ مل کر جائیداد کی ملکیت کا حق رکھتا ہے۔ بعض مخصوص معاشی وسائل کو عوام کے اجتماعی مفاد میں ریاست کی ملکیت میں رکھنا جائز ہے۔

(د) امیروں کی دولت میں غریبوں کا معین حق زکوٰۃ کی شکل میں طے کر دیا گیا ہے، جو قانون کے مطابق وصول کیا جائے گا۔

(ه) تمام ذرائع پیداوار امت کے مجموعی مفاد میں استعمال کیے جائیں گے اور اس میں غفلت یا اس کا غلط استعمال نہیں ہو گا۔

(و) ایک متوازن معیشت کی ترقی کو فروغ دینے اور معاشرے کو استھان سے محفوظ

رکھنے کے لیے، اسلامی قانون میں اجارتہ دار یوں، تجارت پر غیر مناسب پابند یوں، سود (usury)، معابر یوں اور ٹھیکوں میں جبرا اور غلط ترغیب دینے والے اشہارات کی اشاعت کو منوع قرار دیا گیا ہے۔

(ز) تمام معاشی سرگرمیوں کی اجازت ہے، بشرطیکہ کہ امت کے اجتماعی مفاد کے لئے خطرے کا باعث نہ ہوں اور اسلامی قوانین اور اقدار کی خلاف ورزی پرمنی نہ ہوں۔

16- جائیداد کے تحفظ کا حق

ریاست کسی جائیداد کو ضبط نہیں کرے گی مساوئے عوامی مفاد کے جس کا منصفانہ اور مناسب معاوضہ ادا کیا جائے گا۔

17- محنت کشوں کی حیثیت اور وقار

اسلام محنت اور محنت کشوں کو عزت دیتا ہے اور مسلمانوں کو ہدایت کرتا ہے کہ محنت کشوں کے ساتھ منصفانہ بلکہ فیاضانہ سلوک کریں۔ انہیں نہ صرف اجرت کی ادائیگی بروقت اور درست ہونی چاہیے بلکہ وہ مناسب آرام اور تفریح کا حق بھی رکھتے ہیں۔

18- سماجی تحفظ کا حق

سماجی اور برادری کے حاصل وسائل کے مطابق ہر شخص خوراک، رہائش، لباس، تعلیم اور علاج کا حق رکھتا ہے۔ سماج اور برادری کی یہ ذمہ داری ایسے تمام افراد کے بارے میں ہے جو کسی عارضی یا مستقل معدودی کے باعث اپنی دیکھ بھال نہیں کر سکتے۔ (اپنی ضرورت پوری نہیں کر سکتے)

19- خاندان کا حق اور متعلقہ معاملات

(الف) ہر فرد حق رکھتا ہے شادی کا، ایک خاندان بنانے کا اور بچوں کی پرورش کا، اپنے مذہب، روایات اور کلچر کے مطابق۔ ہر شادی شدہ فرد (عورت یا مرد) ایسے حقوق اور مراءات کا حصہ دار ایسے فرائض کو پورا کرنے کا ذمہ دار ہے جو قانون میں طے کیے گئے ہیں۔

(ب) ہر شادی شدہ فرد حق رکھتا ہے کہ دوسرا فریق اس کا احترام کرے اور عہدو پیمان کا لحاظ رکھے۔

- (ج) ہر شوہر اپنے وسائل کے مطابق بیوی اور بچوں کی پروش کا ذمہ دار ہے۔
- (د) ہر بچے کا حق ہے کہ والدین اس کی مناسب پروش کریں۔ ابتدائی عمر میں بچوں سے کام لینا یا ان پر ایسا بوجھڈانا منوع ہے جو ان کی فطری نشوونما اور ترقی کو روک دے یا نقصان پہنچائے۔
- (ه) بچپن اور بڑھاپے میں یا معذوری کی حالت میں ہر فرد کا یہ حق ہے کہ اس کی مادی امداد کی جائے اور دیکھ بھال کے ساتھ اسے تحفظ بھی فراہم کیا جائے۔ والدین بھی یہ حق رکھتے ہیں کہ بچے ان کی مادی امداد کے ساتھ ان کی دیکھ بھال کریں اور تحفظ فراہم کریں۔
- (ز) ماں خصوصی احترام، دیکھ بھال، مدد اور تعاون کا حق رکھتی ہے، خاندان کی طرف سے اور سماج، برادری اور امت کی سطح پر سرکاری اداروں کی طرف سے۔
- (ح) خاندان کے دائرے میں اپنی صنف، اپنی فطری صلاحیتوں، ذہانت اور رجحانات کے مطابق، اولاد اور دیگر رشتہ داروں کے بارے میں اپنی مشترکہ ذمہ داریوں کو ذہن میں رکھتے ہوئے۔ مرد اور عورت دونوں کو اپنی ذمہ داریوں اور فرائض کی تکمیل مل جل کر کرنی ہے،
- (و) کسی فرد (مرد و عورت) کا نکاح اس کی مرضی کے بغیر نہیں ہو سکتا نہ ہی نکاح کی وجہ سے اس کی قانونی حیثیت (شخصیت) میں کوئی کمی واقع ہوگی۔
- شادی شدہ عورت کے حقوق -20**
- ہر شادی شدہ عورت کا حق ہے کہ
- (الف) اسی گھر میں رہے جہاں اس کا شوہر رہتا ہے۔
- (ب) ایسا معیار زندگی رکھے جو اس کے شوہر کے معیار زندگی سے کم نہ ہو، وسائل حاصل کرے، اور طلاق کی صورت میں عدت (انتظار) کی قانونی مدت کے لیے اپنے شوہر کی حیثیت کے مطابق اپنے لیے اور اپنے بچوں کے لیے جو اس کے ساتھ رہتے ہوں یا جن کو وہ دو دھ پلا رہی ہو یا پروش کر رہی ہو، ان کے لیے وسائل

- (ناف و نفقة) حاصل کرے، قطع نظر اس کے، کہ اس کی اپنی مالی حیثیت یا جائیداد کیا اور کتنی ہے جو وہ اپنے حق کے طور پر رکھتی ہے۔
- (ج) قانون کے مطابق نکاح کو ختم کرنے (خلع) کا مطالبہ کر سکتی ہے۔ حق عدالتوں کے ذریعے طلاق حاصل کرنے کے علاوہ ہے۔
- (د) قانون کے مطابق اپنے شوہر، والدین، اولاد اور دیگر رشتہ داروں کی وراثت سے اپنا حصہ لے سکتی ہے۔
- (ه) شوہر یا سابق شوہر (طلاق یا علیحدگی) کی صورت میں عورت کے بارے میں ایسی معلومات کو جو اسے حاصل ہو سکتی ہیں، پوری طرح راز میں رکھے گا، جن کا افشا اس کے مفادات کے لیے خطرناک ہو۔ اپنے شوہر یا سابق شوہر کے بارے میں اس طرح کی ذمہ داری عورت پر بھی عائد ہوتی ہے۔

21 تعلیم کا حق

- (الف) ہر فرد کا حق ہے کہ اپنی فطری صلاحیتوں کے مطابق تعلیم حاصل کرے۔
- (ب) ہر فرد کا حق ہے کہ اپنی آزاد مرضی سے اپنے لیے پیشہ کا انتخاب کرے، اور اپنی فطری صلاحیتوں کو ترقی دینے کے موقع سے استفادہ کرے۔

22 نجی زندگی --- خلوت کا حق

ہر فرد کا حق ہے کہ اپنی نجی زندگی اور خلوت کا تحفظ کرے۔

23 نقل و حرکت اور رہائش کی آزادی کا حق

- (الف) اس حقیقت کے پیش نظر کہ اسلامی دنیا ایک امت ہے، ہر مسلمان کو کسی بھی مسلمان ملک کے اندر یا باہر آزادانہ نقل و حرکت کا حق حاصل ہو گا۔
- (ب) کسی فرد کو اپنی رہائش کا ملک چھوڑنے پر مجبور نہیں کیا جائے گا، یا وہاں سے غیر قانونی طور پر جلاوطن نہیں کیا جائے گا، قانون کے تحت مطلوبہ طریق کا رکن تکمیل کے بغیر۔

نوٹ:

- ☆ اصل متن عربی میں ہے۔ یہ ترجمہ انگریزی سے کیا گیا ہے۔
- ☆ ’فرؤں سے مراد مرد و عورت دونوں اصناف ہیں۔
- ☆ ہر انسانی حق جو اس منشور میں بیان کیا گیا ہے اس کے مقابل ایک فرض بھی ہے۔
- ☆ ’قانون‘ سے مراد ’شریعت‘ ہے جو قرآن و سنت اور ان دونوں سے اخذ کردہ اسلامی فقہ کے کسی بھی مسئلہ کے تحت، قانون کا درجہ رکھتی ہے۔
- ☆ اس منشور میں بیان کردہ حقوق پر عمل یا ان کے حصول کے لیے ہر شخص قانون کے تحت عائد کردہ ان حدود کی پابندی کرے گا جن کا مقصد دوسروں کے حقوق اور آزادیوں کو تسلیم کرنا اور ان کا احترام کرنا، اخلاقی تقاضوں کی تکمیل کرنا، امن و عامہ کو برقرار رکھنا اور مسلم برادری (امت) کی عمومی فلاج و بہبود کو پیش نظر رکھنا ہے۔

(ترجمہ پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق)

اسلام اور انسانی حقوق

اعتقادات سے ہٹ کر کیونکہ وہ سب مذاہب کے بیروکاروں کے انفرادی ہوتے ہیں۔ اسلامی تاریخ میں صلح حدیبیہ، بیشاق مدینہ اور بخاری کی سند ایسی دستاویزات ہیں جن کے معاشرت اور اصول ریاست پر اثرات کا جائزہ لینا، انسانی حقوق کے تصور کے ارتقا کو سمجھنے میں مدد دے سکتا ہے۔ رحمان فیض کا یہ مضمون اسی سمت میں راہنمائی کرتا ہے۔

انسانی حقوق کا تصور انسانوں کے عالمگیر قوانین سے اُبجا گر ہوا جس میں انسانوں کے لئے رنگ، نسل، زبان، علاقائی تعلق یا کسی تاریخی امتیاز کے بغیر یکساں اور بلا امتیاز انسانی حقوق کی تفہیم کی گئی۔ قانونی طور پر انسانی حقوق کے معیارات کو یہن الائقی بیشاق اور یادداشتوں کے ذریعے جانچا اور اپنایا جاتا ہے۔ اسی طرح ریاستی طور پر ان قوانین کو جمہوری معیارات، شخصی آزادیوں اور شہری قوانین کے حوالے سے اپنایا اور جانچا جاتا ہے۔ انسانی حقوق کے جدید تصور کا آغاز گذشتہ صدی کی عالمی جنگ اول اور دوم کے ساتھ ساتھ ہو لوکا سٹ کے بھیانکہ مظالم کے بعد اقوام متعدد کی جزل انسانی میں امن کے موضوع پر ممالک کے درمیان بحث و تجھیص سے ہوا جو بالآخر ممالک کے ایک مشترکہ اعلامیہ کی صورت میں پاس کیا گیا، جسے دنیا آج انسانی حقوق کے عالمی منشور کے نام سے جانتی ہے۔

اگرچہ انسانی حقوق کی باقاعدہ ترویج، تفہیم اور نفوذ کا آغاز گذشتہ صدی میں انسانی حقوق کے عالمی منشور سے ہوا لیکن عالم انسانی میں انسانی حقوق کا تصور اور اطلاق چہ ماں کوئی نیا تصور نہیں ہے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ انسانی معاشروں کے آغاز کے ساتھ ہی انسانی حقوق کی تفہیم اور اطلاق کا کام کسی صورت میں ہوتا رہا ہے۔ معلوم انسانی تاریخ میں انسانی حقوق کی ابتدائی دستاویزات میں قدیم بابل کا حمورابی کا دستور (50 ق م)، عہد نامہ عتیق

(300-1200ق م)، کنفیو شس کی اخلاقیات (571-459ق م)، عہد نامہ جدید اور اسلامی اخلاقیات نمایاں ہیں۔ درج ذیل سطور میں اسلام میں انسانی حقوق کے تصور پر بات کی گئی ہے۔ مذہبی تاریخ میں امن کے موضوع پر جو کچھ بھی لکھا گیا ہے اس کا مرکزی نکتہ یہ ہے کہ امن ایک روحانی صلاحیت ہے جو شخص عزم اور ارادے سے حاصل ہوتی ہے۔ یہ ایک ایسی چیز ہے جو فرد، قوم، جماعت یا ثقافت کو عطا کی جاتی ہے۔ اسلامی نقطہ نظر کے مطابق انسان کی ابتداء ہی سے امن کا راستہ اس کا مطبع نظر رہا ہے۔ اس لحاظ سے اسلام کوئی انفرادی یا نیا راستہ نہیں ہے بلکہ اسلام سے پہلے اپنے اپنے مذاہب پر کاربند تو میں بھی درحقیقت اسلام (سلامتی کے راستے) ہی کی نمائندہ تھیں۔ اسلام باور کرتا ہے کہ امن باہر کی دنیا میں نہیں بلکہ خود انسان کی ذات کے اندر ہی موجود ہے۔ اسلام یہ بھی سمجھاتا ہے کہ آدمی کو اپنی فکر میں آزادی اور تنقید کے رویے کو اپنانے کی کوشش کرنی چاہئے، اس طرح انسان کی ذہانت میں اضافہ ہوتا ہے۔ ذہانت ایک مقدس روح ہے، جو بوقت تخلیق انسان کو عطا کی گئی (15:29)۔ یہ صلاحیت ہر انسان کو ودیعت کی گئی ہے اور یہ وہ چیز ہے جو انسان کے لئے امن کی تلاش اور اس کے قیام کی جدوجہد کو ممکن بناتی ہے۔ دنیاوی مال و دولت کبھی قیام امن کے حصوں میں مدد و معافون ثابت نہیں ہو سکتے بلکہ اخروی نجات کا تصور ہی قیام امن کی بنیاد ہوتا ہے۔ اسلامی نقطۂ نظر کے تحت انسان فطری طور پر امن کی حالت ہی میں زندگی بسر کرتا ہے۔

اسلام کی رو سے انسانوں کو اس لئے تخلیق کیا گیا کہ وہ ایک دوسرے کو شناخت کر سکیں (49:13)۔ جو شخص اپنے آپ کو خدا کی مخلوق سمجھتا ہے وہی دوسرے لوگوں کے ساتھ انصاف کر سکتا ہے اس طرح وہ ان سے بھی اسی طرح محبت کرتا ہے جس طرح وہ اپنے آپ سے کرتا ہے۔ اور یوں وہ اپنی ذات کے ساتھ ساتھ اپنے گرد و نواح میں بھی امن قائم کر سکتا ہے۔ اسلامی نقطۂ نظر یے کے مطابق عدل محض قوانین کا مجموع نہیں ہے بلکہ اس کے لئے رحمدی اور محبت کی بھی ضرورت ہے تاکہ دوسروں کے لئے امن کا راستہ کھلارہ ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ مخصوص حالات میں دشمنوں کو بھی امن کا موقع فراہم کیا جانا چاہئے۔

یہ اسلام کی بنیادی تعلیمات ہی تھیں کہ جن کی بدولت نہ صرف زمانہ امن بلکہ حالت

جنگ کے بھی اصول وضع کئے گئے اور جن کے تحت پیغمبر اسلامؐ ہر جنگ سے پہلے مسلمانوں کو تقویٰ کی تلقین کیا کرتے تھے اور نہتے لوگوں مثلاً بوڑھوں، عورتوں اور بچوں کا خون بہانے، ان سے بدسلوکی کرنے یا انہیں قتل کرنے نیز عام شہریوں کے ساتھ ساتھ قیدیوں کے ساتھ بھی غیر انسانی سلوک سے سختی سے منع فرماتے۔ امن اور انسانی حقوق کے بارے میں اگر اسلامی نقطہ نظر کا اصل مفہوم سمجھنا ہوتا تو اس کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ ہم نبی اسلام حضرت محمد صلعم کی حیات کا مطالعہ کریں۔ ذیل میں نہایت اختصار کے ساتھ حضور اکرمؐ کی سیرت مبارکہ سے کچھ اس انداز میں مستقید ہونے کی کوشش کی گئی ہے کہ جس کی مدد سے ہم اس سوال کا نہایت واضح اور جامع جواب حاصل کر سکیں۔

نبی اسلامؐ کے غیر مسلم اقلیتوں کے ساتھ معاهدوں کے متن سے اندازہ ہوتا ہے کہ دوسرے عالمی مذاہب کی طرح اسلام میں بھی انسانوں کے بنیادی حقوق کو ہمہ وقت پیش نظر رکھا گیا ہے اور اس ضمن میں ہر اس چیز کو ملحوظ خاطر رکھا گیا ہے جو انسانی معاشروں میں مذہبی اقلیتوں کے بنیادی حقوق اور ان کے تحت ایک باعزت زندگی برقرارنے کے لئے ضروری ہے۔ مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان روا داری کی یہ عملہ مثالیں ہیں۔ آنحضرتؐ کے زمانے میں تقریباً سارے ہی جزیرہ نما عرب پر مسلمانوں کی حکومت قائم ہو چکی تھی۔ غیر مسلم رعایا کی حیثیت سے سب سے پہلا معاهدہ نجران کے میسیحیوں کے ساتھ طے پایا۔ نبی اسلامؐ نے اس معاهدے کی جو جزئیات طے کیں وہ درج ذیل ہیں۔

”نجران اور اس کے اطراف کے باشندوں کی جانیں، ان کا نہیں، ان کی زینیں، ان کا مذہب، ان کی زینیں، ان کا مال، ان کے حاضر و غائب، ان کے وفوڈ، ان کے قاصد، ان کی مورتیں، اللہ کی امان اور اس کے رسول ﷺ کی صفات میں ہیں۔ نہ تو ان کی موجودہ حالت ہی میں کوئی تبدیلی کی جائے گی اور نہ ان حقوق میں سے کسی کے حق میں دست اندازی کی جائے گی اور نہ ہی مورتیں بگاڑی جائیں گی۔ کوئی اسقف اپنی اسقفیت سے، کوئی راہب اپنی رہبانیت سے اور ملکیسا کا کوئی منتظم اپنے عہدے سے نہ ہٹایا جائے گا۔ اور جو بھی کم یا زیادہ ان کے قبضے میں ہے اسی طرح ان کے پاس رہے گا۔ زمانہ اسلام سے پہلے کے کسی جرم یا خون کا بدلہ نہیں لیا جائے گا، نہ تو ان کو ظلم کرنے دیا

جائے گا اور نہ ہی ان پر خلُم کیا جائے گا۔ ان سے جو شخص سُود کھائے گا وہ میری ضمانت سے بری ہے۔“

ایک حکومت کے قیام کے بعد آپ ﷺ نے کوہ سنائی کے قریب ایک گرجا گھر (بینٹ کیتھرین چچ) سے متعلق تمام مسیحیوں کو ایک سند نامہ حقوق جاری کیا جو روشن خیالی اور انسانی حقوق کی ایک عمدہ مثال ہے۔ اس دستاویز کے باعث مسیحیوں کو چند ایسی اضافی مراعات کا حصول ممکن ہو گیا جو انہیں اس سے پہلے کے حکمرانوں کے دور میں میسر نہیں تھیں۔ آپ ﷺ نے اعلان کیا کہ جو مسلمان اس دستاویز میں درج احکامات کی خلاف ورزی کرے گا یا اس سے ناجائز فائدہ اٹھائے گا تو اسے معابدہ اللہ سے روگردانی کرنے والا اور خدا کے دین کی تزلیل کرنے والا شمار کیا جائے گا۔ آپ ﷺ نے مسیحیوں کی حفاظت، ان کے گرجا گھروں اور ان سے متعلقہ پادریوں کی رہائش گاہوں کی حفاظت اور انہیں کسی بھی قسم کے نقصان سے بچانے کی ذمہ داری اپنے صحابہ کرام کے ساتھ ساتھ خود اپنی ذات پر بھی عائد کی۔ اس سند نامے (Charter) کی شقیں درج ذیل تھیں۔

☆ مسیحیوں پر کوئی ناجائز نیکس نہ لگائے جائیں گے۔

☆ ان کا کوئی پادری اپنے علاقے سے نہیں نکالا جائے گا۔

☆ کسی مسیحی کو اپنا مذہب تبدیل کرنے پر مجبور نہیں کیا جائے گا۔

☆ کسی راہب کو اس کے راہب خانے سے خارج نہیں کیا جائے گا۔

☆ کسی زائر کو سفر زیارت سے نہیں روکا جائے گا۔

☆ مسجد یا مسلمانوں کا مکان بنانے کے لیے کوئی گرجا گھر مسمار نہیں کیا جائے گا۔

☆ جن مسیحی عورتوں نے مسلمانوں سے شادیاں کر کھی ہیں وہ اپنے مذہب پر قائم رہنے اور عمل کرنے کی مجاز ہوں گی اور اس سلسلے میں ان پر کوئی جبر و کراہ نہیں کیا جائے گا۔

☆ اگر مسیحیوں کو اپنے گرجا گھروں یا خانقاہوں کی مرمت کے لیے یا اپنے مذہب کی کسی رسم کی ادائیگی کے لیے مدد کی ضرورت ہوگی تو مسلمان انہیں امداد دیں گے۔

☆ اس امداد کو ان کے مذہب میں شامل ہونے سے تعبیر نہیں کیا جائے گا بلکہ اسے حاجت مندوں کی حاجت برداری اور خدا اور اس کے رسول ﷺ کے احکامات کی اطاعت سمجھا جائے گا۔

☆ اگر مسلمان کسی بیرونی مسمی طاقت سے برسر پیکار ہوں گے تو مسلمان کے علاقے کی حدود میں آباد مسیحیوں کے ساتھ کسی قسم کی خوارت کا برتاب نہیں کیا جائے گا اگر کوئی مسلمان ایسا کرے گا تو وہ رسول ﷺ کی نافرمانی کا مرتكب تصور ہو گا۔

امن و انسانی حقوق کے اسلامی تصور کی وضاحت کے لیے ضروری ہے کہ دعوتِ اسلام اور اس کے طریقہ کار کا مطالعہ کیا جائے۔ حضور ﷺ نے سب سے پہلے اسلام کی دعوت مکہ میں اپنی قوم کو دی۔ کم و بیش دس سال تک یہ دعوت ہر پہلو سے قوم کے سامنے پیش کی گئی۔ اسے بے شک کچھ لوگوں نے قبول کیا اور اس کے لیے اپنی قوم کا ہر ظلم بھی سہا لیکن معاشرے کے افراد، بحیثیت قوم اس دعوت کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہوئے بیہاں تک کہ آپ ﷺ نے یہ دعوت مکہ سے باہر دوسرے قبائل کے سامنے پیش کی۔ اس دعوت کے تحت آپ ﷺ نے حج کے موقع پر منی میں یہ دعوت عرب کے مختلف قبائل کے سامنے پیش کی۔ تاریخ کی مستند کتابوں کے مطابق سب نے انکار کر دیا مگر یہ رب کے چند لوگ آگے بڑھے اور انہوں نے اسے پورے شرح صدر کے ساتھ قبول کر لیا۔ ان کی تعداد بعض روایات میں چھ اور بعض میں آٹھ بیان کی گئی ہے۔ اس کے بعد آپ ﷺ نے ان لوگوں سے پوچھا کیا تم میری پشت پناہی کرو گے؟ اس کے جواب میں انہوں نے بیان کیا:

”هم اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی خاطر اس کام میں پوری طاقت صرف کرنے کے لیے تیار ہیں، لیکن اس وقت ہم آپ کی خدمت میں یہ عرض کرنا چاہتے ہیں کہ ہم لوگ باہمی عداوت میں بنتا ہیں، ابھی کچھ سال ہمارے ہاں جنگ بعاث ہوئی ہے۔ اس حالت میں اگر آپ تشریف لے گئے تو ہم آپ کی قیادت پر بجمع نہ ہو سکیں گے۔ آپ فی الحال ہمیں اپنے لوگوں کی طرف واپس جانے دیجئے۔ امید ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمارے باہمی تعلقات درست فرمادیں گے۔ ہم آپ سے وعدہ کرتے ہیں کہ آئندہ سال میں آپ سے پھر ملاقات ہو گی۔“
(الطبقات الکبریٰ، ابن سعد)

چنانچہ یہ رب پہنچ کر انہوں نے اس کے لیے جدوجہد شروع کی۔ دوسرے سال ان کے ۱۲ آدمی نبی اسلام ﷺ سے عقبہ کے مقام پر ملے۔ ان میں پانچ آدمی تو ہی تھے، جنہوں نے کچھ سال اسلام قبول کیا تھا۔ باقی سات آدمیوں میں سے پانچ قبلہ خرزنج اور دواوں

کے تھے۔ ان سے معلوم ہوا کہ اسلام کی دعوت اگرچہ ان کے سب گھر انوں میں پھیل چکی ہے، لیکن ان کے ارباب حل و عقد بھی تک ایمان نہیں لائے۔ یہ لوگ مدینہ والپس جانے لگے تو حضور ﷺ نے اپنے ایک صحابی حضرت مصعب بن عميرؓ کو ان کے ساتھ کر دیا۔ ان کی رہنمائی میں ان لوگوں نے بڑی تیزی کے ساتھ یثرب میں اسلام کی تبلیغ شروع کی۔ چنانچہ اگلے سال یعنی ۱۴ بعدبعثت میں زمانہ حج آنے تک اوس و خزر ج کے ارباب حل و عقد اور اشراف و اکابر اسلام میں داخل ہو گئے اور اس طرح بغیر کسی جارحانہ اقدام کے دعوت کے ذریعے سے یثرب کا سیاسی اقتدار آنحضرت کو منتقل ہوا، اسلامی تاریخ کا پہلا ”دارالاسلام“ وجود میں آیا اور انقلاب برپا ہو گیا۔ رسول اکرم ﷺ نے ایک فرمان روا کی حیثیت سے اسی عقبہ کے مقام پر اہل یثرب سے بیعت سمع و طاعت لی۔ اور اس کے کم بیش تین ماہ بعد یثرب کا اقتدار سنجنالے کے لیے کم سے روانہ ہو گئے۔ سید ابوالاعلیٰ مودودی اپنی کتاب ”سیرت رسول عالم“ میں ”بیعت عقبہ کی اہمیت“ کے زیر عنوان لکھتے ہیں:

”اسلام کی تاریخ میں یہ ایک انقلابی موقع تھا جسے خدا نے اپنی عنایت سے فراہم کیا اور نبی ﷺ نے ہاتھ بڑھا کر تھام لیا۔ اہل یثرب نبی ﷺ کو حض ایک پناہ گزین کی حیثیت سے نہیں بلکہ خدا کے نائب اور اپنے فرمان روا کی حیثیت سے بلا رہے تھے، اور اسلام کے پیروں کو ان کا بلا و اس لیے نہ تھا کہ وہ اجنبی سرز میں میں محض مہاجر ہونے کی حیثیت سے جگہ پالیں، بلکہ مقصد یہ تھا کہ عرب کے مختلف قبائل اور خطوں میں جو مسلمان منتشر ہیں وہ یثرب میں جمع ہو کر اور یثربی مسلمانوں کے ساتھ مل کر ایک منظم اسلامی معاشرہ بنالیں۔ اس طرح یثرب نے دراصل اپنے آپ کو ”مذہبۃ الاسلام“ کی حیثیت سے پیش کیا اور نبی ﷺ نے اسے قبول کر کے عرب میں پہلا ”دارالاسلام“ بنالیا۔“ (ج ۲، ص ۷۰۶)

یہ ریاستی انقلاب اس طرح برپا ہوا کہ اس کے لیے کوئی جتنا منظہم نہیں ہوا، کوئی مظاہرہ نہیں کیا گیا۔ کوئی لاٹھی نہیں چلی، کوئی تلوار نہیں اٹھائی گئی، صرف دعوت پیش کی گئی، اس سے لوگوں کے دل و دماغ مسخر ہوئے، ان کے ارباب حل و عقد نے پورے وثوق کے ساتھ اس کو تسلیم کیا اور یوں ایک پرامن انسانی معاشرے کا قیام عمل میں آ گیا۔ مدینہ پہنچتے ہی نبی

اسلام ﷺ نے اس ریاست کا دستور تحریر کیا۔ تاریخ میں یہ ”بیثاق مدینہ“ کے نام سے مشہور ہے جس میں غیر مسلموں کو نہ صرف اس نئی ریاست کا شہری تسلیم کیا گیا بلکہ انہیں اور مسلمانوں کو سیاسی لحاظ سے ایک وحدت قرار دیا گیا اور دیت، تصاص اور صلح و جنگ کا قانون رقم کیا گیا۔ یہی ”بیثاق مدینہ“ ہے۔ جس کے بعد ایک باقاعدہ حکومت وجود میں آگئی اور نبی ﷺ نے اس حکومت کے سربراہ کی حیثیت سے سیاسی، معيشت، معاشرت، حدود و تعزیرات اور دوسرے معاملات سے متعلق پورا قانون چند ہی برسوں میں اس ریاست میں پوری طرح نافذ کر دیا۔

چنانچہ فتح مکہ سے بہت پہلے نکاح، طلاق، میراث، بیع و شرا، مزارعت، شفہ کے معاملات، سود اور جوئے کی ممانعت کے خواطیب نافذ کیے گئے، صلح و جنگ کا اسلامی قانون جاری ہوا، شوریٰ کی روایت قائم ہوئی، حدود مجرموں پر جاری کی گئیں، انسانوں کے بیچ اونچ بیچ، جبر و استبداد اور ظلم و استھصال کی جڑ کاٹی گئی، عدل و قسط کے تصورات کو حقیقت میں نافذ کیا گیا اور یوں یہ نمولود معاشرہ اس پر امن انقلاب کے تمام ترثیمات کے ساتھ نمودار ہوا۔

نبی ﷺ سیرت کے موضوع پر ذخیرہ علمی میں جو چیز ایک ناقابل تردید دستاویزی شہادت کی حیثیت سے اس حکومت کو ثابت کرتی ہے۔ وہ ”بیثاق مدینہ“ ہے۔ یہ بیثاق ابن ہشام، ابن کثیر اور ابو عبیدہ قاسم بن سلام نے بالترتیب اپنی کتابوں ”السیرۃ النبویہ“، ”البدایۃ والنہایۃ“ اور ”کتاب الاموال“ میں لفظ بلفظ نقل کیا ہے۔ اس کے بعد اقتباسات ”سنن ابی داؤد“، ”مسند احمد بن جنبل“، ”تاریخ طبری“، ”لسان العرب“ اور ”طبقات ابن سعد“ میں نقل ہوئے ہیں۔ دور حاضر کے محققین نے اسے جس طرح ترتیب دیا ہے اس کے مطابق اس کی ۵۶ دفعات ہیں۔ پہلی ۲۳ دفعات مہاجرین و انصار سے متعلق اور باقی مدینہ کے یہودی قبائل کے حقوق و فرائض سے بحث کرتی ہے۔ اس دستاویز کو دین و شریعت کو سمجھنے اور حصول حقوق کے ارادے سے پڑھنے پر یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ یہ ”معاہدہ حدیبیہ“ کی طرح دو جماعتوں یا دو قوموں کے درمیان کوئی معاہدہ امن نہیں، بلکہ اپنی ایک ایک دفعہ کے لحاظ سے رعایا حکمران کے حقوق و فرائض پر مشتمل ایک باقاعدہ دستور ہے

جسے تاریخ عالم کے ابتدائی تحریری، دستاں کے ساتھ دنیا کے سامنے پیش کیا جاسکتا ہے۔ چنانچہ تمام دستوری دستاویزات کی طرح اس میں صرف وہی مسائل زیر بحث آئے ہیں جو نظم مملکت کی اساس قرار دیے جاسکتے ہیں اور دستوری قانون کے ماہرین جانتے ہیں کہ وہ بنیادی طور پر پانچ ہی ہوتے ہیں:

ایک، مملکت کی نوعیت۔

دوسرے، نظم ریاست میں حکومت اور اطاعت کے مراجع

تیسرا، صلح و جنگ اور امور خارجہ

چوتھے، شہریوں کے حقوق و فرائض

پانچویں، جرم و سزا میں عدالت و مرافعہ کے اختیارات

اسلام کے اس پہلے معاهدے سے انسانی حقوق کی پاسداری، اسلامی معاشرے کی

بنیادی فکر، پر امن مقاصد اور مذہبی رواداری کا اظہار ہوتا ہے۔ میثاق مدینہ وہ تاریخی معاهدہ تھا

جس کے تحت مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان حقوق و فرائض، مذہبی رواداری اور قیامِ

امن کے بنیادی اصول وضع کیے گئے۔ چنانچہ اس معاهدے کے تحت مدینے میں آباد یہودیوں

اور دوسری غیر مسلم اقلیتوں کو مندرجہ ذیل حقوق و مراعات کا حصول ممکن ہو گیا۔

1- ہر فریق اللہ کی حفاظت و ضمانت میں ہے۔

2- امت کے مسلم اور غیر مسلم ہر دارکان کو ایک ہی جیسے سیاسی اور مذہبی حقوق حاصل ہیں۔

اسی طرح امت کے تمام ارکان کو مکمل مذہبی آزادی اور خود مختاری حاصل ہے۔

3- امت کے دشمنوں سے مسلم اور غیر مسلم دونوں مل کر جنگ کریں گے اور جنگ کے اخراجات بھی

مشترک طور پر برداشت کریں گے۔ مسلمان اور غیر مسلم دونوں ایک دوسرے کے بھی خواہ ہیں۔

اسلامی حکومت کی اس پہلی معاهداتی دستاویز سے جو بانی اسلام ﷺ کے ہاتھوں تشکیل پائی،

ایک ریاست کی وسیع القلمی، رواداری اور باہمی اخوت کا اظہار ہوتا ہے جس میں بنیاد پرستی اور

تعصب جیسی کوئی چیز نہیں۔ آج سے تقریباً ۱۴۰۰ ہزار سال پہلے تشکیل پانے والے اس تحریری

معاهدے کی بدولت اس پہلے اسلامی معاشرے کی ترویج ہوئی جس سے ملک میں رہنے والے

سبھی افراد کو یکساں حقوق کی بنیاد پر عقیدہ و مذہب کی آزادی کا حق حاصل ہوا اور یوں انسانی زندگی کی حرمت کا تعین بھی کر دیا گیا۔ اس دستاویز کو شروع سے آخر تک پڑھنے سے اس کی تمام دفعات میں ان پانچ چیزوں کی تفصیلات ملتی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اس دستور کے تحت قائم ہونے والی حکومت ایک وفاقی حکومت ہے، اس کا علاقہ اس کے شہر یوں کے لیے حرم اور اس سے متعلق تمام شہری سیاسی لحاظ سے ایک امت، حقوق و فرائض کے اعتبار سے بالکل برابر اور اپنے دینی معاملات میں پوری طرح آزاد ہیں، اس کے مجرم سب کے مجرم ہیں اور اس میں قصاص و دیت کے معاملات ایک قاعدے اور دستور کے مطابق ہے ہوتے ہیں، اس کی جنگ ہر شہری کی جنگ اور اس کی صلح ہر شہری کی صلح ہے اور اس کا کوئی باشندہ مملکت سے باہر اس کے کسی دشمن کے ساتھ براہ راست کوئی معاملہ نہیں کر سکتا۔

تاریخ اسلامی کے نامور عالم ڈاکٹر محمد حمید اللہ نے ”عہد نبوی میں نظام حکمرانی“ کے نام سے اس موضوع پر اپنی جو کتاب مرتب کی ہے جس میں ایک پورا باب اس دستاویز کے لیے مختص کیا ہے اور اس کا عنوان، ”دنیا کا پہلا تحریری دستور“، قرار دیا ہے، اسے ”ترجمہ دستورِ مملکتِ مدینہ بہ عہد نبوی“ کے زیرعنوان نقل کیا ہے اور اس کے بارے میں لکھا ہے:

”مدینہ منورہ میں بھرت کر کے آنے کے پہلے ہی سال رسول کریم ﷺ نے ایک نوشۃ مرتب فرمایا جس میں حکمران اور عالیا کے حقوق اور فرائض اور دیگر فوری ضروریات کا تفصیلی ذکر ہے۔“
(ص ۷۲)

”لیکن ایک واقعی مملکت کی بنیاد بھرت کے بعد ہی پڑی۔ بھرت کر کے مدینہ آتے ہی آنحضرت ﷺ نے فوراً اپنے عدالتی حقوق و فرائض کا تعین فرمادیا تھا، اور ہماری خوش قسمتی سے دل چسپ اور اہم دستاویز بجس سے وہ بظہر ہم تک نقل ہوتی آئی ہے۔ اسے سب سے پہلی اسلامی مملکت کا دستور اور آئین کہا جا سکتا ہے۔“ (ص ۱۵۳)

”یہ عہد آفریں کا رسم، اسی دستاویز میں ریکارڈ میں لا یا گیا جس نے قبائلیت کی افرا تقری کا خاتمہ کر دیا اور ایک وسیع تر ادارے، یعنی مملکت کی بنیاد ڈالی۔ اس دستاویز میں آنحضرت ﷺ نے عدالتی، تشریعی، فوجی اور تنقیدی اختیارات اپنے لیے محفوظ فرمائیے۔“

(ص ۷۳)

علام اسلام کے ممتاز عالم اور محقق امام ابو زہرہ نے سیرتِ نبوی پر اپنی کتاب، ”خاتم الانبین“ کی دوسری جلد میں بھرت کا ذکر ”اسلامی حکومت کی تائیس“ کے عنوان سے شروع کیا ہے اور اس میں جہاں ”میثاقِ مدینہ“ کی دفعات نقل کی ہیں، وہاں اس دستاویز کا تعارف اس طرح کرایا ہے:

”اور نبی ﷺ نے اس دستور میں وہی قانون بیہود اور دوسرے غیر مسلموں پر جاری کر دیا جو مسلمانوں پر ان کے شعوب و قبائل کے بارے میں جاری کیا اس طرح کہ ان کے حقوق فرائض مسلمانوں ہی کی طرح ہوں گے ان پر دین و عقیدہ کے معاملہ میں کوئی تعدد نہ کی جائے گی اور حکومت و فرمان روائی رسول اللہ ﷺ کی ہوگی۔“

اسی طرح ”الرِّحْقُ الْخَتُومُ“ جو رابطہ عالم اسلامی کے عالمی مقابلہ سیرت نگاری میں دنیاۓ اسلام کے جید علماء کے فیصلے کے مطابق اول انعام کی مستحق قرار پائی، اس کے مصنفوں مولانا صفحی الرحمن صاحب مبارک پوری نے اس دستور کا خلاصہ اپنی اس کتاب میں بیان کیا اور اس کے بارے میں پوری صراحة کے ساتھ لکھا ہے:

”اس معاهدے کے طے ہو جانے سے مدینہ اور اس کے اطراف ایک وفاقی حکومت بن گئے جس کا دارالحکومت مدینہ تھا، اور جس کے سربراہ رسول اللہ ﷺ تھے اور جس میں کلمہ نافذہ اور غالب حکمرانی مسلمانوں کی تھی، اور اس طرح مدینہ واقعًا اسلام کا دارالحکومت بن گیا۔“ (ص ۳۰۲)

سید ابوالاعلیٰ مودودی نے بھرت کے بعد اور فتح مکہ سے پہلے ریاست مدینہ میں عہد بے عہد اس انقلاب کی سرگزشت کو اپنی تصنیف ”تفہیم القرآن“ میں اس طرح پیش کیا ہے:

”مدینہ پہنچ کر اسلامی دعوت ایک نئے مرعلے میں داخل ہو چکی تھی۔ مکہ میں تو معاملہ صرف اصول دین کی تبلیغ اور دین قبول کرنے والوں کی اخلاقی تربیت تک محدود تھا مگر بھرت کے بعد عرب کے مختلف قبائل کے وہ سب لوگ جو اسلام قبول کر چکے تھے ہر طرف سے سمت کر ایک جگہ جمع ہونے لگے اور انصار کی مدد سے ایک چھوٹی سی اسلامی ریاست کی

بنیاد پر گئی تو اللہ تعالیٰ نے تمدن، معاشرت، قانون اور سیاست کے متعلق بھی اصولی ہدایات دینی شروع کیں اور یہ بتایا کہ اسلام کی اساس پر یہ نیا نظام زندگی کس طرح تعمیر کیا جائے۔“
(ج، ص ۲۷)

”یا تو وہ وقت تھا کہ جنگِ احمد کے صدمہ نے مسلمانوں کے لیے مدینہ کے قریبی ماحول کو بھی پر خطر بنا دیا تھا اب یہ وقت آ گیا کہ عرب میں اسلام ایک ناقابل شکست طاقت نظر آنے لگا اور اسلامی ریاست ایک طرف خجد تک، دوسری طرف حدود شام تک، تیسری طرف ساحل بحر احمر تک اور چوتھی طرف مکہ کے قریب تک پھیل گئی۔“ (ج، ص ۲۳۵)

”پھر ان چند برسوں میں اسلامی اصول اور نقطہ نظر کے مطابق مسلمانوں کی اپنی ایک مستقل تہذیب بن چکی تھی جو زندگی کی تمام تفصیلات میں دوسروں سے الگ اپنی ایک امتیازی شان رکھتی تھی۔ اخلاق، معاشرت، تمدن، ہر چیز میں اب مسلمان غیر مسلموں سے بالکل ممیز تھے۔ تمام اسلامی مقبوضات میں مساجد اور نماز با جماعت کاظم قائم ہو گیا تھا۔ ہر بستی اور ہر قبیلے میں امام مقرر تھے۔ اسلامی قوانین دیوانی و فوج داری بڑی حد تک تفصیل کے ساتھ بن چکے تھے اور عادات کے ذریعے سے نافذ کیے جا رہے تھے۔ لیں دین اور خرید و فروخت کے پرانے معاملات بند اور نئے اصلاح شدہ طریقے رانج ہو چکے تھے۔ وراشت کا مستقل ضابطہ بن گیا تھا۔ نکاح اور طلاق کے قوانین پر دہ شرعی اور استیذ ان کے احکام اور زنا و قذف کی سزا میں جاری ہونے سے مسلمانوں کی معاشرتی زندگی ایک خاص سانچے میں ڈھل گئی تھی۔ مسلمانوں کی نشست برخاست، بول چال، کھانے پینے، وضع قطع اور رہنے سہنے کے طریقے تک اپنی ایک مستقل شکل اختیار کر چکے تھے۔ اسلامی زندگی کی ایسی مکمل صورت گری ہو جانے کے بعد غیر مسلم دنیا اس طرف سے قطعی مایوس ہو چکی تھی کہ یہ لوگ جن کا اپنا ایک الگ تمدن بن چکا ہے پھر کبھی ان میں آ ملیں گے۔“ (ج، ص ۲۳۵)

دور حاضر کے معروف اسلامی مفکر ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے اس مسئلے سے اختلاف کیا ہے اور دلیل دی ہے کہ مدینہ میں خود قرآن مجید سے معلوم ہوتا ہے کہ یہود یوں کی اپنی عدالتیں قائم تھیں اور لوگوں کو اس بات کا اختیار تھا کہ چاہیں تو اپنے مقدمات حضور ﷺ

کے سامنے پیش کریں اور چاہیں تو یہودیوں کی عدالتوں میں لے جائیں اور حضور ﷺ کو بھی ان کے مقدمات لینے یا نہ لینے کی اجازت اللہ نے دے رکھی تھی۔ پھر کیا اس صورت حال میں یہ مانا جاسکتا ہے کہ یہ کوئی باقاعدہ حکومت تھی؟ اور کیا کوئی حکومت ایسی بھی ہو سکتی ہے جس میں شہریوں کو اس طرح کے اختیارات حاصل ہوں اور جس میں خود سربراہ مملکت کے لیے یہ بات روکھی جائے کہ وہ اگر چاہے تو ان کے مقدمات سننے سے انکار کر دے؟

بعض دوسرے مفکرین مثلًا جاوید غامدی صاحب نے ڈاکٹر صاحب کی اسی دلیل ہی سے ان کا موقف رد کرتے ہوئے یہ بات ثابت کی ہے کہ ”اسلامی شریعت اور اس کے علوم و معارف سے ان کی اجنبيت میں وقت کے ساتھ اضافہ ہی ہوا ہے۔ اس میں کوئی کمی نہیں آئی۔ شریعت کی رو سے یہ حق اسلامی حکومت کے غیر مسلم شہریوں کو ہر جگہ اور ہر زمانے میں دیا جاسکتا ہے کہ وہ اپنے دینی اور شخصی معاملات سے متعلق مقدمات کے لیے اپنی عدالتیں اپنے اہتمام میں قائم کر سکتے ہیں اور یہ قانون بنایا جاسکتا ہے کہ عدالتوں کی موجودگی میں اگر اپنا کوئی مقدمہ وہ مسلمان امراء حکام کے سامنے پیش کریں تو اس مقدمہ کو لینے یا نہ لینے کا فیصلہ یہ امراء احکام اپنی صوابدید کے مطابق کرنے کا اختیار رکھتے ہیں۔ اس ضمن میں غامدی صاحب نے سید سابق کا یہ بیان فتحۃ السنۃ“ سے نقل کیا ہے:

”رہے وہ معاملات جو عقائد و عبادات کی نوعیت کے دینی شعائر یا نکاح و طلاق کی قسم کے عالی مسائل سے متعلق ہیں تو ان میں انہیں پوری آزادی حاصل رہے گی۔ اس کی بنیاد فقہ اسلامی کا یہ قاعدہ ہے کہ ان کے دینی معاملات میں کسی نوعیت کی کوئی مداخلت نہ کی جائے۔ تاہم وہ اگر کوئی مقدمہ ہمارے پاس لے کر آئیں گے تو ہمیں حق ہے کہ چاہیں تو اپنی شریعت کے مطابق اس کا فیصلہ کر دیں اور چاہیں تو یہ مقدمہ لینے سے انکار کر دیں۔“

یہ ایک ثابت شدہ تاریخی حقیقت ہے کہ صرف عہد رسالت ہی میں نہیں بلکہ اس کے بعد بھی مسلمانوں نے اپنی حکومتوں میں بنیادی انسانی حقوق کے حوالے سے معاشرے کے تمام افراد کے لیے مساوی طرز عمل اختیار کیا۔ اس کی تفصیلات تاریخ کی مستند کتب میں دیکھی جاسکتی ہیں جن کے تحت مسلمان حکمرانوں کے زیر انتظام علاقوں میں صرف اہل کتاب

ہی کے ساتھ نہیں بلکہ تمام شہریوں کے لیے انہی اصولوں کی روشنی میں فیصلے کیے گئے۔ محمد بن قاسم کے بارے میں تمام مورخین متفق ہیں کہ اس نے سندھ اور ملتان کی فتح کے بعد ہندوؤں کی عدالتیں بدستور قائم رہنے دیں۔ ترکوں کے متعلق بھی معلوم ہے کہ انہوں نے روپیوں اور یونانیوں کو یہی مراعات دی۔ ڈاکٹر محمد حمید اللہ اپنی کتاب ”عہد نبوی میں نظام حکمرانی“ کے مضمون ”قرآنی تصویرِ مملکت“ میں لکھتے ہیں:

”ام خضرت ﷺ کا یہ طرز عمل بعد میں مستقل قانون بن گیا کہ غیر مسلم رعایا اور مستامنوں سے ان کا شخصی قانون ہی متعلق ہوا اور اس غرض کے لیے خصوصی عدالتیں بنائی گئیں۔ چنانچہ خلافت راشدہ میں اس چیز نے خاصی ترقی کر لی تھی اور ان ملی عدالتوں کے حکام بھی ہم ملت ہی مقرر ہوتے تھے۔“ (ص ۱۵۷)

اس ضمن میں انہوں نے ”فرانسیسی قاموں تاریخ و جغرافیہ کیلیسا“ کا رالف سکلی کا ایک اقتباس نقل کیا ہے جس میں وہ کہتے ہیں:

”مسلمانوں کی سب سے اہم جدت جس کا یعقوبی مسیحیوں نے دلی خوشی سے استقبال کیا۔ یہ تھی کہ ہرمذہب کے پیروؤں کو ایک خود مختار وحدت قرار دیا جائے اور اسی مذہب کے روحانی سرداروں کو ایک بڑی تعداد میں دنیاوی اور عدالتی اقتدارات عطا کیے جائیں۔“ (ص ۱۳۹)

اہم سوالات اور جوابات

1- انسانی حقوق کی تعریف کیا ہے؟

ج: انسانی حقوق کی ایک جامع تعریف یہ ہے۔

‘یہ وہ اصول، ضابطے اور قانون ہیں جو بلا کسی امتیاز کے تمام انسانوں کو تحفظ اور آزادیوں کی ضمانت دیتے ہیں۔’ گویا انسانی حقوق اپنی ترکیب میں کچھ بنیادی تحفظ اور آزادیاں ہیں۔ مثلاً قانون کے مطابق کارروائی کا تحفظ، جان و مال کا تحفظ اور آزادی مثلاً سیاسی عمل میں شرکت کی آزادی، نقل و حرکت کی آزادی، تحریر و تقریر کی آزادی وغیرہ۔ کسی حق کا انسانی حقوق کھلانے کی شرط یہ ہے کہ وہ بلا امتیاز ہو اور یہ دنیا کے قوانین (مقامی یا بین الاقوامی)، ضابطوں اور رواجوں کی شکل میں ہوتے ہیں۔ آج کل انسانی حقوق ایک جدید معاشرتی علم بھی ہے۔ یہ بطور مضمون دنیا بھر میں تعلیم و تدریس کا حصہ ہیں۔

2- کیا انسانی حقوق کی سوچ اور معیارات مغربی ہیں؟

ج: اگر اس حقیقت کو سامنے رکھا جائے کہ تاریخ انسانی میں معاشروں اور تہذیبوں نے علوم و فنون میں ایک دوسرے سے استفادہ کیا ہے۔ یوں علوم، معیارات اور سوچ انسانوں کا مشترکہ اثاثہ بن جاتے ہیں۔ جس طرح دنیا کے ایک کونے سے ایجاد ہونے والی اشیا دوسرے کونے تک پہنچ جاتی ہیں اور انسانوں کو اسے استعمال کرنے میں کوئی اعتراض نہیں ہوتا۔ اس طرح اصول کی حد تک یہ بات درست ہے کہ اچھی سوچ کو اپنانے میں کوئی ہرج نہیں چاہے وہ کہیں سے بھی آئی ہو لیکن حقیقت تو یہ ہے کہ انسانی حقوق کی سوچ ابھارنے میں اہل مشرق کا بھی خاطر خواہ حصہ ہے جیسے انسانی حقوق کے عالمگیر اعلامیہ کی تدوین میں جن تین ماہرین نے بنیادی کام کیا ان میں دو کا تعلق ایشیا (چین) اور مشرق

وسطیٰ (لبنان) سے تھا۔ اسی طرح پاکستان سے سر ظفر اللہ اور پٹرس بخاری نے اقوامِ متحده کے ابتدائی سالوں میں جس وقت انسانی حقوق کی ابتدائی دستاویزات تیار کی جائی تھیں، ان میں بھرپور حصہ لیا۔ پاکستان نے خاص طور پر بچوں کے حقوق کے معاهدہ (منظور کردہ 1989ء) کی تیاری میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا، جس میں مسودے پر بحث اور حکومتوں کو اس معاهدے کو منظور کرنے کے لیے آمادہ کرنا شامل تھے۔ لہذا یہ کہنا بجا ہوگا کہ انسانی حقوق کے قوانین اور معیارات ایک بین الاقوامی سوچ کی نمائندگی کرتے ہیں۔

3۔ انسانی حقوق اور مذاہب کا آپس میں کیا تعلق ہے؟

ج: انسانی حقوق کے معیارات میں مذہبی آزادی ایک بہت نمایاں حق تسلیم کیا جاتا ہے۔ لیکن انسانی حقوق کے اصول اور ضابطے بناتے وقت کسی ایک یا زیادہ مذاہب سے براہ راست استفادہ نہیں کیا گیا۔ اس کی بجائے انسانی تاریخ (تجربہ) اور شعور کو استعمال کیا گیا ہے جس کے ارتقا میں یقیناً مذاہب کا کردار رہا ہے۔ اس وقت انسانی حقوق کے فریم ورک کوئی مذاہب کے افراد، جماعتوں اور نمائندوں کی حمایت حاصل ہے۔ لیکن اس کو انفرادی یا مشترکہ حمایت سے مشروط نہیں کیا گیا۔ انسانی حقوق کی مباحثت میں انسانوں کے پس منظر (مذہبی، سماجی، معاشی اور دیگر) سے ماوراءات کی جاتی ہے لہذا قطع نظر کہ کسی کا عقیدہ کیا ہے، اس کے عقیدے کا احترام انسانی حقوق کا اصول قرار پاتے ہیں۔ اس کے علاوہ چونکہ آج کل سماجی تحقیقات کا دور ہے لہذا اگر کسی عقیدے کے لوگوں کا ذکر آئے گا تو وہ ایک سماجی اکائی یا گروہ کے طور پر ہو گا نہ کہ اس کے عقائد زیر بحث لائے جائیں۔ البتہ ان کے سماجی تفاضل اور رویے کا ذکر آسکتا ہے۔

4۔ کیا انسانی حقوق مختلف مذاہب کے ذریعے انسانوں تک آنے والے ضابطہ ہائے حیات سے الگ اور بہتر معیارات ہیں؟ اگر نہیں تو پھر ان کی کیا ضرورت ہے؟

ج: جس طرح کسی ملک کا آئینہ بنیادی اصول طے کرتا ہے اور قانون سازی کے طریقہ

کار اور حدود تعین کرتا ہے پھر اس کی روشنی میں لاتعداد قوانین بن سکتے ہیں جو وقت کی ضرورت کے مطابق ہوتے ہیں۔ اس طرح ملک اور معاشرے اپنی نمو کے دروازے کھلے رکھتے ہیں کیونکہ بدلتے وقت کے ساتھ پرانے قوانین غیرموزوں بھی ہو جاتے ہیں نئے قوانین بنانے پڑتے ہیں۔ مثلاً برطانیہ کے دور سے ایک قانون پاکستان میں آیا جو ہاتھیوں کے تحفظ کے بارے میں ہے۔ آج کل پاکستان میں ہاتھی صرف چڑیا گھر میں ہوتے ہیں۔ پرانے زمانے میں عام گھومتے پھرتے تھے لہذا اب قانون بنے گا تو چڑیا گھر کو سامنے رکھ کر بنا جائے گا۔ عام لوگوں کا نہ ہاتھیوں سے اور نہ ہی ایسے قانون سے واسطہ ہوگا۔ ہر مذہب اپنے پیروکاروں کے لئے اخلاق و کردار کی راہنمائی کرتا ہے۔ لیکن اس کی روشنی میں اپنے لئے زندگی کے اسلوب کا چنانہ کرنا ایک الگ بات ہے۔ دوسری طرف انسانی حقوق قانون سازی کے تاریخی اور متعدد تجربات کے بعد ایسا نچوڑ ہیں جن پر زیادہ تر ممالک اور مختلف پس منظر کے افراد کا اتفاق رائے ہے۔ ایک کثیر المذہب دنیا میں جہاں ایک دوسرے سے واسطہ پڑتا ہے وہاں الگ الگ مذہبی فکر اور روایات کے باوجود کچھ مشترکہ معیارات کا تعین ایک منطقی بات ہے۔ انسانی حقوق کی سوچ اور منطق بھی یہی ہے۔

5۔ انسانی حقوق اور ضروریات زندگی میں کیا فرق ہے؟

ج: انسانی حقوق ہر انسان کی ضرورت ہیں لیکن انکا اکثر ماہرین ضروریات زندگی کو حقوق سے الگ چیز گردانے ہیں کیونکہ ضروریات زندگی کے اعتبار سے مشترکہ معیارات کا تعین کرنا انتہائی مشکل کام ہے۔ ایک وقت میں کسی انسان کی ضرورت روٹی ہے تو دوسرے لمحے نیند کچھ عرصے تک روٹی نہ ملے تو انسان کی زندگی خطرے میں پڑ سکتی ہے اور کسی کیفیت میں نیند نہ آنا اس کی زندگی کے لئے مہلک ثابت ہو سکتا ہے۔ لہذا ضروریات کی فہرست بہت لمبی ہو سکتی ہے اور چونکہ ضروریات کا تعین مختلف معاشی، سماجی، نفسیاتی، انفرادی، طبعی اور دیگر کیفیات کے ناطے ہوتا ہے لہذا ان کو حقوق سے الگ رکھا گیا ہے۔ مثلاً انسانی حقوق کے اعلامیہ میں روٹی کپڑا اور مکان نہیں ہے لیکن روزگار کے حق کو تسلیم کیا گیا

ہے۔ انسان کے پاس روزگار ہوتا پھر وہ خود تعین کرے کہ اسے پہلے کیا چاہیے اور بعد میں کیا۔

6۔ فلاجی، ترقیاتی اور انسانی حقوق کی تنظیموں کے مقاصد اور طریقہ کار میں کیا فرق ہے؟
ج: انسانی بھلائی کے کام کرنے والی تنظیمیں جو آسودہ حال لوگوں سے چندہ یا اشیا اکٹھا کر کے حاجت مندوں میں تقسیم کرتی ہیں تقریباً سبھی معاشروں میں بڑی تعداد میں پائی جاتی ہیں۔ یہ سوچ فوری اور ہنگامی نویعت کی ضروریات پورا کرنے میں بڑی اہم اور رضا کار ان کام کی بڑی عمدہ روایت ہے۔ گلی محلے میں پانی کی سبیل سے لے کر ان کی خدمت کا دائرة عبدالستار ایڈھی کی ایک بولینس گاڑیوں اور مرٹریسا کے قائم کردہ یتیم خانوں تک پھیلا ہوا ہے۔ یہن الاقوامی سطح پر ریڈ کراس، ریڈ کریسٹ اور سکاؤٹ تنظیم اس کی جدید اور منظم اشکال ہیں۔ روٹری کلب اور الیس اولیس تنظیم بھی انہی خطوط پر کام کرتے ہیں۔ ان کو چیرٹی یا فلاجی تنظیمیں کہتے ہیں۔ اس اپروچ میں چند کمزوریوں کے باعث ایک نئے طریقہ کار کو اپنایا گیا ہے جسے جامع ترقی کی سوچ کہا جاتا ہے۔ فلاجی طریقہ کار میں جن کمزوریوں کی نشاندہی کی گئی وہ مندرجہ ذیل تھیں۔

ا۔ حاجت مند ہمیشہ حاجت مند رہتا ہے اور صدیوں کی خیرات اور کھربوں روپوں کا ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں منتقل ہونا بھی سماجی رشتہوں یا معیارِ زندگی میں تبدیلی کا باعث نہیں بنتا۔

ب۔ باوجود کہ کسی انسان کو مشکل میں دیکھ کر مدد کے جذبے سے سرشار ہو جانا فطری بات ہے لیکن بغیر کسی ادارتی انتظام اور چیک اینڈ بیلنس کے اس جذبے کے معاشرتی اطلاق میں انحصار کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ معاشرے کا ایک حصہ ذاتی طور پر ہاتھ پر ہاتھ دھرے منتظر فردار رہتا ہے۔ پیر اسائٹ بن جاتا ہے اور پیداواری عمل سے باہر رہتا ہے۔
ج۔ پاکستان جیسے ملک میں بھکاریوں کی فوج کو لجھتے۔ یہ لوگوں کے نیکی کے جذبات کا استھنا کرنے کے لئے کیا کیا ناک نہیں کرتے نیجے یہ ہوتا کہ ایک تو بھیک مانگنا باقاعدہ پیشہ اور رویہ بن جاتا ہے، دوسرے کچھ لوگ جو درست امداد کے مستحق ہوتے ہیں وہ بعض

مرتبہ تغافل کا شکار ہو جاتے ہیں۔

د۔ فلاح کی اس شکل میں جو سرگرمیاں ہوتی ہیں اس سے معاشرے میں اونچے نیچے جوں کی توں رہتی ہے۔ اس لئے نئے اور پرانے صاحبانِ ثروت سمیت سرکاری مشینزی ایسی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں۔ لیکن کسی ایسے پروگرام کی ضرورت باقی رہتی ہے جس سے محتاجوں کی محتاجی کو طویل مدت کے لئے یا مکمل طور پر ختم کیا جاسکے۔

ان اعتراضات کے ناطے ایک نئی سوچ ابھری، جس میں جامع ترقی کو مقصد بنایا گیا جو مالی اور سماجی اعتبار کے علاوہ ذہنی بلوغت کی طرف لے جائے، جس سے لوگ اپنے فیصلے کرنا خود سیکھیں۔ اس طریقہ کار کا ایک خاص نعرہ یہ تھا کہ ”محفلی پکڑ کر دینے کی بجائے محفلی پکڑنا سکھایا جائے۔“ پاکستان میں اس ماذل کے کامیاب تجویزوں میں اور لگی پائلٹ پروجیکٹ کے علاوہ این آر ایس پی اور آغا خان فاؤنڈیشن کے کئی منصوبے ہیں۔ کاریتاس پاکستان بھی ایسے کئی کامیاب منصوبے چلا چکی ہے۔

جنوبی ایشیا میں سب سے نمایاں مثال بغلہ دیش کے گرائمین بک کی ہے جو کچھ وسائل مہیا کر کے خود انحصاری لگیے کے ذریعے ایک خاطر خواہ کامیابی، غربت کے خاتمے، مہارتوں اور روزگار کے پھیلاؤ کے ضمن میں حاصل کر چکے ہیں۔ یاد رہے کہ یہ وہ سرگرمیاں ہیں جو عوامی اور ترقیاتی کام سے متعلق ہوتی ہیں ان کے لئے صوبوں اور وفاق میں الگ وزارتیں بنائی جاتی ہیں اور کثیر رقم اور دیگر وسائل ان کے لئے منصوص کئے جاتے ہیں۔

انسانی حقوق کی تنظیموں، رضاکار تنظیموں کی تیسری قسم ہے جس کے طریقہ کار اور مقاصد میں حقوق کے احترام کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ انسانی وقار اور حقوق کی پامالی کی وجوہات کو سامنے رکھا جاتا ہے۔ مثلاً وسائل سے محرومی کو سامنے رکھ کر سوال کیا جائے کہ ایسا کیوں ہے تو پہنچتا ہے کہ انسانی حقوق کی پامالی کی وجہ کہیں کوئی فرد، کہیں معاشرتی نظام اور رواج تو کہیں سرکاری حکاموں اور اداروں کی غفلت ہے یعنی اگر حقوق کی پامالی ختم ہو جائے اور حقوق مل جائیں تو محتاجی نہ رہے گی۔ لہذا وطرح کے کام کیے جاتے ہیں ایک تو انسانی حقوق کے بارے میں شعور کو عام کرنا، حقوق کی خلاف ورزی کی نشاندہی

کرنا اسے انسانی حقوق کے فروغ میں شمار کیا جائے گا۔ دوسرے جہاں خلاف ورزیاں ہوتی ہیں وہاں عدالتوں اور سرکاری اداروں سے رجوع کر کے، ذرائع ابلاغ کے ذریعے انسانی حقوق کا دفاع کیا جاتا ہے۔ وہ حقوق جو ملک کے آئین، قوانین اور بین الاقوامی قانون میں تسلیم کئے گئے ہیں، ان کا اطلاق ایسے موقع اور گنجائش پیدا کر سکتا ہے جس سے نہ صرف ضروریات پوری ہو سکیں بلکہ شہریوں میں برابری کا احساس اور باہمی احترام پیدا ہو جائے۔

7- انسانی حقوق کے تصورات اور معیارات میں کیا خاص بات ہے جو اس سے پہلے نہیں ہوئی؟

ج: انسانی حقوق درحقیقت تو وہی سوچ اور اصول بقائے باہمی ہے جو صدیوں سے موجود ہے لیکن یہ انسانی حقوق کا ہی اعجاز ہے کہ دنیا میں پہلی مرتبہ مختلف قوموں، مذاہب اور ثقافتوں کے لوگ کثیر تعداد میں ان پر اتفاق کرتے ہیں۔ اس تاریخی کامیابی کا تعلق اقوام متحده کے قیام سے بھی ہے۔ انسانی حقوق کی ترویج اقوام متحده کے تین بنیادی مقاصد میں سے ایک ہے۔ دوسری خاص بات یہ ہے کہ انسانی حقوق کے جدید تصورات میں ان تمام امتیازات کو ختم کیا گیا ہے جو پہلے کسی نہ کسی شکل میں موجود تھے۔ اس طرح انسانی حقوق کے نفاذ اور قبولیت میں وسعت پائی جاتی ہے جو انہیں کسی بھی مذہبی رواج یا ملکی قانون سے ممتاز کرتی ہے۔

8- کیا انسانی حقوق کا فریم و رک ایک سماجی تبدیلی یا انقلاب کا ذریعہ بن سکتا ہے؟

ج: بنیادی طور پر انسانی حقوق کا فریم و رک (خاکہ) کسی فوری تبدیلی کی بجائے حقوق کے احترام میں ہمہ جہت اضافے کے ذریعے مرحلہ وار تبدیلی (ارتقا) کی سوچ پر منی ہے۔ البتہ معاشرے اپنی کوشش اور سنجیدگی سے تبدیلی کے دورانیہ کو کم کر سکتے ہیں۔ انقلاب کے بر عکس (جو اکثر بندوق کے زور پر آتے اور بندوق کے ذریعے جاتے ہیں) انسانی حقوق معاشرے میں مکالمے اور شعور کی بنیاد پر تبدیلی اور انسانی حقوق کی پامالیوں کو

روکنے کے راستے تلاش کرنے سے عبارت ہے۔ انسانی حقوق کی جدوجہد پر امن طریقے اور قانون کے دائرے میں رہ کر کی جاتی ہے۔ وہ سماجی تبدیلی جو حقوق کے تسلیم ہونے کے ضمن میں آتی ہے، پائیدار ہوتی ہے اور معاشروں کو مستحکم کرتی ہے۔ البتہ اگر کوئی معاشرہ انسانی حقوق کے قومی ادارے بنانے میں کئی دہائیوں تک غافل رہے تو وہاں انسانی حقوق کی جدید سوچ بھی کیا فوائد مہیا کر سکتی ہے مثلاً ہندوستان میں انسانی حقوق کے کمیشن سرکاری سطح پر کئی دہائیوں سے کام کر رہے ہیں۔ لیکن انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں کے مقابلے میں کام کی رفتار بہت سُست رہی۔ پاکستان میں اگر عورتوں کے حقوق اور انسانی حقوق کے کمیشن بنائے بھی گئے تو ان کی سفارشات کو ماننا کبھی ضروری نہیں سمجھا گیا۔ لیکن اس کے بعد جنوبی کوریا کے سرکاری انسانی حقوق کمیشن نے قابلِ قدر اور مثالی کام کیا ہے۔

9۔ ریاستیں انسانی حقوق کے نفاذ کی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے میں ناقام کیوں ہوتی ہیں؟ تباہی سے کیوں کام لیا جاتا ہے؟

ج: ایک تو یہ ریاستوں کا روایتی کردار ہے۔ اسی لئے کہا جاتا ہے کہ حقوق تسلیم نہیں کئے جاتے، کرواۓ جاتے ہیں۔ حکومتوں کو حقوق کے تسلیم اور لاگو ہونے میں اظاہر اور صرف وقتی طور پر کسی نقصان کا سامنا کرنا پڑتا ہے اس لئے وہ اس کی مخالفت کرتے ہیں۔ مثلاً اگر بچوں کی مشقت پر پابندی پر عمل درآمد ہونا شروع ہو جائے تو پاکستان میں فوری طور پر بے روزگاری کا خاتمه ہو سکتا ہے۔ لیکن چونکہ آجر بچوں سے کم اجرت پر کام کروالیتا ہے لہذا وہ یہ بہانہ بناتا ہے کہ غربت کی وجہ سے بچوں کی مشقت جائز بھی ہے اور ضروری بھی۔ حکومتیں تب کسی حق کو تسلیم کرتی ہیں جب ان کے پیچھے ایک وسیع عوامی ہمایت ہو۔ البتہ دنیا کے کئی ممالک جہاں حکومتیں خود حقوق سلب کر کے بنائی جاتی ہیں۔ وہاں جمہوریت اور قانون کی حکمرانی کا فندان ہوتا ہے۔ وہ حقوق کے معاملے کو محض اپنے فائدے کی نظر سے دیکھتی ہیں۔ بادیِ انظر میں حکومتیں کسی نظریے یا اصول کا فائدہ تب اٹھانے کی کوشش کرتی ہیں جب اس نظریے کی مقبولیت بڑھ جائے۔ لیکن یہ کام اس

نظریے اور اصول کے مخالفوں کا ہوتا ہے کہ وہ کیسے حقوق کے ابھنڈا کو حکمرانوں کے ہاتھوں مختلف مقاصد کے لیے استعمال ہونے سے روکتے ہیں۔ دنیا بھر میں انسانی حقوق کے محافظین اسی لیے حکومتوں کے زیر عتاب آتے ہیں کہ بعض مرتبہ حکومت کی ترجیحات اور انسانی حقوق کی ترجیحات میں نکراو پایا جاتا ہے۔

10- کیا اقوام متحده میں چھوٹے اور کمزور ممالک کے حق میں فیصلے ہوتے ہیں؟

ج: اقوام متحده انسانوں کا بنایا ہوا ادارہ ہے۔ اس میں خوبیاں اور خامیاں ہو سکتی ہیں لیکن مسائل کے حل اور فیصلوں کے بارے میں دو طرح سے جائزہ لینا پڑے گا۔ ایک تو یہ کہ کیا مسائل اقوام متحده کے ہوتے ہوئے حل ہونا ممکن ہیں یا اس کی غیر موجودگی میں۔ اقوام کے اس پلیٹ فارم کی موجودگی میں جzel اسیبلی اور دیگر فورمز پر ہر ملک (کمزور یا طاقتوں) بات کر سکتا ہے نیز اس کے لیے رائے عامہ ہموار کرنے کے دیگر طریقوں کے علاوہ ووٹ اپنی مرضی سے استعمال کر سکتا ہے۔ اسی وجہ سے اقوام متحده کے پلیٹ فارم سے محصولات، فضاء اور سمندر کے استعمال، بین الاقوامی تجارت اور قرضے غرض کی مفید بین الاقوامی معابدے ہوئے۔ غالباً ادارہ صحت اور یونیسیف نے کئی جگہوں پر بیماریوں کے خاتمے، بچوں کی تعلیم، آبادی کی بہبود اور دیگر کئی معاملات میں قابل قدر خدمات سرانجام دیں۔ اقوام متحده کے ان اداروں کا براہ راست اور زیادہ فائدہ انجمنی ممالک کو ہوا جو ترقی پذیر ہیں۔

11- اقوام متحده کشمیر، چینیا اور فلسطین (خود اختاری) کے مسائل کیوں حل نہ کروائیکی؟

ج: اقوام متحده ملکوں کے میں کام کرنے والا ایک ادارہ ہے۔ ملک اس کے ماتحت کام نہیں کرتے۔ دوسرے لفظوں میں یہ اینٹرنشنل باؤڈی ہے۔ سپر انٹرنشنل نہیں۔ سپر انٹرنشنل باؤڈی کی مثال یورپین یونین ہے جیسے ایک کرنی کا نظام بناتا تو رکن ممالک میں وہ کرنی اپنائی گئی۔ خارجہ پالیسی کے کچھ نکات پر اتفاق رائے ہے۔ کچھ ممالک ویزا (شجن) مشترک کہ دیتے ہیں۔ اس کے برعکس اقوام متحده وہی کام سرانجام دے سکتی ہیں۔ جس پر رکن ممالک

اتفاق کر لیں۔ مصالحت بھی تب کروائی جائے گی جب دو ممالک جن کا کوئی تنازعہ ہے وہ مصالحت کے لیے آمادہ ہوں اور اگر ممالک معاهدہ تاشقند (1965ء) اور شملہ معاهدہ (1971ء) کے ذریعے یہ طے کر لیں کہ وہ تمام معاملات دو طرفہ بات چیت سے طے کریں گے تو اقوام متحده کا کردار ختم ہو جاتا ہے۔ پاکستان کوئی مرتبہ موقع ملا کہ وہ کشمیر کا مسئلہ سلامتی کو نسل میں قرارداد پیش کر کے اٹھائے مگر ایسا نہیں کیا گیا۔

چھپینا کے مسئلے پر سب سے زیادہ زور دار تنقید اقوام متحده میں ہائی کمشنز برائے انسانی حقوق محترمہ میری رابنسن نے کی۔ انہوں نے نہ صرف چھپینا کا دورہ کر کے ایک رپورٹ مرتب کی بلکہ براہ راست روشنی حکومت کو صورتحال کا ذمہ دار قرار دیا۔ فلسطین کے مسئلے کو اجاگر کرنے کے لیے کئی قرارداد ایں اقوام متحده میں منظور کی گئیں اور تنظیم برائے آزادی فلسطین (پی ایل او) کو یہ موقع ملا کہ وہ اقوام متحده کے عام اجلاس میں مبصر کے طور پر مستقل نشست لے سکے۔ یہ فلسطینی ریاست کے قیام کی ضرورت پر ایک انتہائی درست اور مضبوط اقدام تھا۔ قبرص تنازعے پر اقوام متحده نے ترکی اور یونان کے درمیان جنگ کو روکے رکھا اور قبرص کے پر امن حل کے فارمولے پر عمل ہو رہا ہے۔ سوڈان ڈارفر میں صورت حال کو قابو میں لانا بھی اقوام متحده کے اداروں کی وجہ سے ممکن ہوا۔ پاکستان میں کیونکہ اقوام متحده کے متعلق واقفیت کم اور اس کے خلاف پروپیگنڈا زیادہ ہے اس لیے ضروری ہے کہ اقوام متحده کی کارکردگی کا بغور اور غیر جانبداری سے جائزہ لیا جائے۔

12۔ کیا گزشتہ سلامتی کو نسل کے اندر محض پانچ ملکوں کو ویو کا اختیار مانا نا انصافی نہیں؟
ج: ایگ آف نیشنز کی ناکامی کے بعد اقوام متحده کے تجربے میں ایک بات یہ پیش نظر تھی کہ ان وجوہات کو ختم کیا جائے جن کی وجہ سے پہلا ادارہ ختم ہوا تھا۔ اتحادی ملکوں نے یہ اختیار اپنے پاس رکھا تو اختیارات کی تقسیم کے اعتبار سے نا انصافی تھی لیکن امن و سلامتی کے حوالہ سے ایک ذمہ داری ان اقوام پر آئی جو طاقتور تھے۔ اس کا ایک فائدہ تو یہ ہوا کہ تیسری عالمی جنگ نہیں ہوئی۔ دوسرے جہاں کئی تنازعات میں اقوام متحده جنگیں روکنے میں ناکام ہوئی تو کئی بار کامیاب بھی ہوئی۔ تیسرا اگر عراق پر اقوام متحده /

سلامتی کو نسل میں جنگ کی قرارداد کو سامنے رکھیں تو امریکہ کی کوشش کے باوجود ویٹو کی ”ذمہ داری“ کی حیثیت واضح ہو جاتی ہے۔ فرانس کی اعلانیہ مختلف اور روس اور چین کی عدم حمایت کے ڈر سے امریکہ نے قرارداد پیش نہیں کی اور عراق میں اتحادی جنگ کو عالمی حمایت نہیں ملی۔ اب سلامتی کو نسل کی توسعے کے لیے کام ہو رہا ہے۔ جس کے خاطر خواہ متوجہ نکلنے کی توقع ہے۔ (دیکھئے اقوام متحده میں اصلاحات)

13- قرارداد، اعلامیہ اور معاهدہ میں کیا فرق ہے؟

ج: قرارداد سے مراد بالعموم جزء اسیبلی کی قرارداد ہے اور اس کی حیثیت کسی ملک کی پارلیمنٹ میں قرارداد جیسی ہوتی ہے۔ یہ باقاعدہ قانون نہیں لیکن کسی مسئلے پر توجہ دلانے کا ذریعہ ہوتی ہے۔ اب تک ہزاروں کی تعداد میں قراردادیں پاس ہو چکی ہیں۔ اقوام متحده کی قراردادیں کسی بحث میں مضبوط دلیل اور حوالے کے طور پر استعمال ہوتی ہیں۔ اعلامیہ ایسی دستاویز ہے جس کا جواز اقوام متحده کے چارٹر سے لیا جاتا ہے بلکہ یوں سمجھیں یہ اعلامیہ اقوام متحده کے مقاصد (عالمی امن، انسانی حقوق، انسانی ترقی) کا تسلسل ہوتا ہے۔ لہذا یہ اتفاق رائے یا اکثریت رائے سے پاس کر لیا جاتا ہے۔ اور اس پر کسی ملک کو دستخط کرنے کی ضرورت پیش نہیں آتی کیونکہ چارٹر کا تسلسل ہے جس پر ہر رکن ملک کے دستخط ہوتے ہیں۔ اعلامیہ کا مقصد مختلف موضوعات پر اصول وضع کرنا اور روایت کی نشاندہی کرنا ہے البتہ عملی اقدامات کے قیعنی اور حقوق کے خود خال کو واضح کرنے کے لیے معاهدے کی ضرورت پیش آتی ہے۔

معاهدے اور ان کا مسودہ قانون پیش کرنے کے لیے کم از کم 30 ممالک کی طرف سے تحریک پیش کرنا ضروری ہوتا ہے۔ پھر بحث مبارکہ کے بعد اس کو جزء اسیبلی میں پیش کیا جاتا ہے۔ اگر کم از کم 60 ممالک اس کو منظور کر لیں تو پھر یہ رکن ممالک کو دستخط کے لیے پیش کر دیا جاتا ہے رکن ممالک رضا کار نہ اور آزاد مرضی سے چاہیں تو اس پر مشروط یا غیر مشروط طور پر دستخط اور توثیق کر سکتے ہیں۔

14- انسانی حقوق سے متعلق معاهدوں پر عمل درآمد کا نظام کیا ہے؟

ج: ایک تو ہر معہدے میں اس بات کا انتظام ہوتا ہے کہ اس معہدے کے مطابق ہونے والے اقدامات اور اس موضوع سے متعلق ملکی صورت حال پر ایک رپورٹ ہر تین یا پانچ سال بعد اس معہدے کے تحت قائم کی گئی کمیٹی کو پیش کی جائے۔ انسانی حقوق سے متعلق نو بڑے معہدے یہ ہیں۔

- 1 شہری اور سیاسی حقوق کا بین الاقوامی بیثاق (1966)
- 2 معاشری، سماجی اور ثقافتی حقوق کا بین الاقوامی بیثاق (1966)
- 3 ٹارچ کے خاتمے کا بیثاق (1984)
- 4 نسلی امتیاز کے خاتمے کا بیثاق (1966)
- 5 بچوں کے حقوق کا بیثاق (1989)
- 6 عورتوں کے خلاف تمام امتیازات کے خاتمے کا بیثاق (1979)
- 7 افراد باہم معدودی کے حقوق کا معہدہ (2006)
- 8 غیر متعاقی مزدوروں اور اہل خانہ کے حقوق کا معہدہ (2003)
- 9 جبکہ گندگی سے تحفظ کا معہدہ (2006)

پاکستان نے آخری دو معہدوں کے علاوہ باقی سات معہدوں کی توثیق کر رکھی ہے۔ پاکستان توثیق کردہ تمام معہدوں پر رپورٹ پیش کرنے کا مجاز بھی ہے، پابند بھی۔ لیکن تمام معہدات پر پاکستان کی طرف سے اپنے ملک میں اقدامات پر سالوں روپرینگ نہیں کی گئی جس سے یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ متعلقہ وزارتیں انسانی حقوق کے معہدوں کے بارے میں کتنی سنجیدہ ہیں۔ معہدوں کے اندر ایک کمیٹی تشکیل دینے کا انتظام ہوتا ہے۔ اس کمیٹی کے کرن موضع پر بین الاقوامی ماہرین ہوتے ہیں جو دنیا بھر سے لیے جاتے ہیں۔ یہ کمیٹیاں اپنے طور پر بھی حقائق اکٹھے کر کے ایک جائزہ پیش کرتی ہیں۔ بعض صورتوں میں ان کمیٹیوں میں عام شہری اور تنظیمیں اپنی شکایات بھیج سکتی ہیں۔ جیسے شہری اور سیاسی حقوق کے معہدے کی غرمانی کرنے والی انسانی حقوق کی کمیٹی کو اس

کے علاوہ اس ملک کی روپورٹ پیش کی جا رہی ہو۔ وہاں کی رضا کار یا غیر سرکاری تنظیمیں مجاز ہیں کہ وہ سرکاری روپورٹ کے مقابلے میں اپنی متبادل روپورٹ پیش کر سکیں۔ لیکن درحقیقت معاهدات کا فائدہ کسی ملک کے عوام کو بھی پہنچتا ہے جب حکومتیں سنجیدگی کا مظاہرہ کریں اور اپنے ملک میں حقوق کی پامالیوں کے امکانات کو کم سے کم کرتی جائیں۔

15- بین الاقوامی معاهدات پر دستخط اور توثیق کیا طریقہ کار ہے؟

ج: معاهدے کو منظور کرنے کے لیے توہ ملک کا مستقل مندوب اقوام متحده میں ووگنگ میں حصہ لیتا ہے لیکن بعض اوقات معاهدہ پر دستخط کسی ملک کے وزیر خارجہ یا وزیر قانون سے لیے جاتے ہیں جو کہ اپنے ملک کی کابینہ سے منظوری حاصل کرنے کے بعد کرتے ہیں۔ کسی بین الاقوامی معاهدے کی توثیق سے پہلے پارلیمنٹ کو اعتماد میں لینے کی روایت بھی موجود ہے تاہم اس کو مشروط اس لیے نہیں کیا گیا کہ بعض ملکوں میں سرے سے پارلیمنٹ کا کوئی تصور ہی نہ تھا جبکہ کئی ملکوں میں مارشل لاونگر کی وجہ سے کئی کئی سال پارلیمنٹ کا وجود نہیں تھا۔

16- اقوام متحده میں این جی اوز کا کیا کردار ہوتا ہے؟

ج: این جی اوز اقوام متحده میں بہت اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ انسانی ترقی، صحت اور قدرتی آفات سے منٹنے کے لیے جو پروگرام تشکیل پاتے ہیں ان کے لیے فنڈز اور رضا کار مہماں کرنے میں غیر سرکاری تنظیمیں پیش پیش رہی ہیں۔ اس کے علاوہ اقتصادی اور سماجی کوئی دنیا بھر سے این جی اوز کو اقوام متحده میں رجسٹر بھی کرتی ہے۔ ان کو تین طرح سے خاص اور عام مشاورت کا کردار ملتا ہے۔ اقوام متحده میں کئی فورمز پر ان این جی اوز کو اپنی رائے دینے اور مسائل کی نشاندہی کی دعوت دی جاتی ہے۔ گویا اجازت محدود وقت اور ایجنڈا کے مطابق دی جاتی ہے۔ البتہ انسانی حقوق کوئی ممالک نے این جی اوز کے کردار کو محدود کرنے کی کوشش نہیں کر دی ہے۔ آگے چل کر واضح ہو گا کہ این جی اوز کو اس اہم ادارے میں اپنا کردار ادا کرنے کے کیا کیا موقع ملیں گے لیکن مختلف کمیٹیوں،

ورکنگ گروپس کے اجلاس اور خاص طور پر اقوام متحده کی طرف سے منعقدہ بین الاقوامی کانفرنسوں میں یہ گنجائش رکھی جاتی ہے کہ این جی او ز اقوام متحده کے نظام میں فعال کردار ادا کر سکیں۔

17۔ انسانی حقوق کے دفاع سے متعلق خصوصی مبصر کا کیا کردار ہوتا ہے؟

ج: ضرورت کے مطابق سیکرٹری جزل کی منظوری کے ساتھ ایسے موضوعات یا امور پر خصوصی مبصر یا نمائندے مقرر کیے جاتے ہیں جو دنیا بھر کے ملکوں میں صورتحال کا جائزہ لیتے اور حکومتوں کی دعوت پر ممالک کا دورہ بھی کرتے ہیں اور اس ملک کی رپورٹ اور سفارشات مرتب کرتے ہیں۔ بعد ازاں یہ رپورٹ سیکرٹری جزل کو پیش کی جاتی ہے اور اقوام متحده کی تمام پلک دستاویزات کی طرح ہر خاص و عام کے لیے انٹرنیٹ لا بھری یوں کو مہیا کر دی جاتی ہے۔

خصوصی مبصرین کے نظام کو پیش پر ویجہ بھی کہا جاتا ہے یہ مختلف ممالک کے لیے بھی بنائے گئے جیسے افغانستان، برما وغیرہ۔ مبصرین کا مینڈیٹ ضرورت کی نمائندگی پر جزل اسمبلی یا ایکوسوک میں قرارداد کے ذریعے وجود میں آتا ہے۔ آئندہ انسانی حقوق کو نسل ان مبصرین کے کردار اور تعداد وغیرہ پر رائے زنی کر سکتی ہے۔ جنیوا میں انسانی حقوق کے ہائی کمشنر کا دفتر ان مبصرین کے سیکرٹریٹ کا کام کرتا ہے جبکہ مبصرین ہائی کمشنر کی ٹیم کے طور پر کام کرتے ہیں گویہ ہائی کمشنر کے ماتحت ہر گز نہیں ہوتے۔

انسانی حقوق کا عالمگیر اعلامیہ

تمہید:

چونکہ دنیا میں آزادی، انصاف اور امن کی بنیاد اس امر پر ہے کہ ہر انسان کی عزت نفس اور احترام نیز انسانوں کے مساوی اور ناقابل انتقال حقوق کو تسلیم کیا جائے چونکہ انسانی حقوق سے لاپرواٹ اور ان کی خلاف ورزی کے ایسے وحشیانہ نتائج نکلے ہیں کہ ان سے انسانی ضمیر لرز اٹھتا ہے اور عام انسانوں کی اعلیٰ ترین آرزو یہ رہی ہے کہ ایسی دنیا وجود میں آئے جس میں تمام انسانوں کو اپنی بات کہنے اور اپنے عقیدے پر قائم رہنے کی آزادی حاصل ہو اور جو خوف اور محرومی سے پاک ہو چونکہ یہ ضروری ہے کہ انسانی حقوق کو قانون کی عملداری کے ذریعے یقینی بنایا جائے۔ ورنہ انسان جبر اور استبداد کے خلاف خود بغاوت کرنے پر مجبور ہو جائے گا۔

چونکہ یہ ضروری ہے کہ قوموں کے درمیان ووستانہ تعلقات کو بڑھایا جائے چونکہ اقوام متحده کی رکن قوموں نے چارٹر میں بنیادی انسانی حقوق، انسانی شخصیت کے احترام اور قدر نیز مردوں اور عورتوں کے مساوی حقوق کے بارے میں اپنے عقیدے کی توثیق کی ہے اور وسیع تر آزادی کی فضائل معاشرتی ترقی کو فروغ دینے اور معیار زندگی کو بلند کرنے کا ارادہ کر لیا ہے۔

چونکہ رکن ملکوں نے یہ عہد کر لیا ہے کہ وہ اقوام متحده کے اشتراک عمل سے ساری دنیا میں اصولی اور عملی طور پر انسانی حقوق اور بنیادی

آزادیوں کا زیادہ احترام کریں گے اور کرامیں گے۔
چونکہ اس عہد کی تکمیل کے لیے بہت ہی اہم ہے کہ ان حقوق اور
آزادیوں کی نوعیت کو سب سمجھ سکیں لہذا:

- 1- تمام انسان آزاد اور حقوق و عزت کے اعتبار سے برابر پیدا ہوئے ہیں۔ تمام انسان خمیر اور عقل رکھتے ہیں۔ انہیں ایک دوسرے کے ساتھ بھائی چارے کا سلوک کرنا چاہیے۔
- 2- ہر شخص اس اعلان میں بیان کردہ تمام آزادیوں اور حقوق کا مستحق ہے اور ان پر نسل، رنگ، جنس، زبان، مذہب اور سیاسی خیالات یا کسی قسم کا عقیدہ، قومیت، معاشرہ، دولت یا خاندانی حیثیت وغیرہ اثر انداز نہیں ہوں گے۔
- اس کے علاوہ کسی بھی شخص کے ساتھ اس کی علاقائی، قومی، سیاسی، علمی یا بین الاقوامی شناخت کی بنابر کوئی امتیازی سلوک نہیں کیا جائے گا۔ چاہے یہ ملک یا علاقہ آزاد ہو یا کسی دوسرے ملک کی تحویل میں ہو یا اقتدار اعلیٰ کے لحاظ سے کسی اور بندش کا پابند ہو۔
- 3- ہر شخص کو اپنی زندگی، آزادی اور ذاتی تحفظ کا حق ہے۔
- 4- کسی شخص کو غلام یا لوٹدی بنا کرنہیں رکھا جائے گا۔ غلامی اور برده فروشی، اس کی ہر شکل منوع ہوگی۔
- 5- کسی شخص کو جسمانی اذیت یا ظالمانہ، انسانیت سوزیاً ذلت آمیز سزا نہیں دی جائے گی۔
- 6- ہر شخص کا یہ حق ہے کہ ہر جگہ اس کی قانونی حیثیت کو تسلیم کیا جائے گا۔
- 7- قانون کی نظر میں سب انسان برابر ہیں اور سب انسان بغیر کسی تفریق کے قانون کے تحت امان پانے کے حقدار ہیں۔ اس اعلامیہ کی خلاف ورزی میں ہونے والے امتیازات یا ان کی ترغیب سے تحفظ کا یکساں حق سب انسانوں کو ہے۔
- 8- ہر انسان کو دستور یا قانون میں دیئے گئے بنیادی حقوق کے منافی اقدامات کے خلاف با اختیار ملکی عدالتوں سے موثر طور پر دادرسی کا حق ہے۔
- 9- کسی شخص کو من مانے (غیر قانونی) طریقے سے گرفتار، نظر بند یا جلاوطن نہیں کیا جائے گا۔
- 10- ہر شخص کو یکساں طور پر حق حاصل ہے کہ اس کے حقوق و فرائض کے تعین یا اس کے خلاف

عائد کردہ کسی الزام کی تحقیق کے سلسلے میں اسے آزاد اور غیر جانبدار عدالت میں کھلی اور منصفانہ سماعت کا موقع ملے۔

11- (1) ہر ایسے شخص کو جس پر کوئی فوجداری الزام عائد کیا جائے، اس وقت تک بے قصور سمجھا جائے جب تک اس پر کھلی عدالت میں قانون کے مطابق جرم ثابت نہ ہو جائے اور اسے اپنی صفائی پیش کرنے کا پورا موقع اور تمام ضمانتیں نہ دی جا چکی ہوں۔

(2) کسی شخص کو کسی ایسے فعل یا کوتایی کی بنا پر جوار تکاب کے وقت قومی یا بین الاقوامی قانون میں تعزیری جرم شمار نہیں کیا جاتا تھا، کسی تعزیری جرم میں ملوث نہیں کیا جائے گا اور نہ ہی اسے کوئی ایسی سزا دی جائے گی جو جرم کے ارتکاب کے وقت کی مقرر کردہ سزا سے زائد ہو۔

12- کسی شخص کی نجی زندگی، گھر یا زندگی، گھر بار، خط و کتابت میں من مانے (غیر قانونی) طریقے سے مداخلت نہ کی جائے گی اور نہ ہی من مانے طریقے سے اس کی عزت اور نیک نامی پر حملے کیے جائیں گے۔ ہر شخص کو ایسے حملے یا مداخلت سے تحفظ کا قانونی حق ہے۔

13- (1) ہر شخص کو اپنی ریاست کی حدود کے اندر نقل و حرکت کرنے اور کہیں بھی سکونت اختیار کرنے کی آزادی کا حق ہے۔

(2) ہر شخص کو حق حاصل ہے کہ وہ کسی ملک سے باہر چلا جائے چاہے یہ ملک اس کا اپنا ہو اور اسی طرح سے اسے اپنے ملک میں واپس آنے کا بھی حق ہے۔

14- (1) ہر شخص کو عقیدہ کی بنیاد پر اذیت رسانی سے بچنے کے لیے دوسرے ملکوں میں پناہ حاصل کرنے اور اس رعایت سے فائدہ اٹھانے کا حق ہے۔

(2) یہ حق ان عدالتی کارروائیوں سے بچنے کے لیے استعمال نہیں کیا جا سکتا جو خالصتاً غیر سیاسی جرائم یا ایسے افعال کی وجہ سے عمل میں آتی ہیں جو اقوام متعدد کے مقاصد اور اصولوں کے خلاف ہے۔

15- (1) ہر شخص کو قومیت کا حق ہے۔

(2) کسی شخص کو من مانے طور پر اس کی قومیت شناخت سے محروم نہیں کیا جائے گا اور نہ ہی اس کو اپنی قومیت تبدیل کرنے کا حق دینے سے انکار کیا جائے گا۔

16- (1) بالغ مردوں اور عورتوں کو بغیر کسی ایسی پابندی کے جو نسل، قومیت یا مذہب کی بنا پر لگائی جائے، شادی کرنے اور گھر بسانے کا حق ہے۔ مردوں اور عورتوں کو نکاح، ازدواجی زندگی اور نکاح کو فتح کرنے کے معاملے میں برابر کے حقوق ہیں۔

(2) شادی فریقین کی پوری اور بلا جبر رضا مندی سے ہوگی۔

(3) خاندان، معاشرے کی فطری اور بنیادی اکائی ہے۔ وہ معاشرے اور ریاست دونوں کی طرف سے تحفظ کا حق دار ہے۔

17- (1) ہر انسان کو تنہایا دوسروں کے ساتھ مل کر جائیداد رکھنے کا حق ہے۔

(2) کسی شخص کو زبردستی اس کی جائیداد سے محروم نہیں کیا جائے گا۔

18- ہر انسان کو آزادی، فکر، آزادی، ضمیر اور آزادی، مذہب کا پورا حق ہے۔ اس حق میں مذہب یا عقیدے کو تبدیل کرنے اور اجتماعی یا انفرادی طور پر خاموشی سے یا کھلے بندوں اپنے عقیدے کی تبلیغ، اس پر عمل کرنے، عبادات میں شریک ہونے اور رسومات پوری کرنے کی آزادی بھی شامل ہے۔

19- ہر شخص کو اپنی رائے رکھنے اور اظہار رائے کی آزادی کا حق ہے۔ اس حق میں یہ امر بھی شامل ہے کہ وہ آزادی کے ساتھ اور بغیر کسی مداخلت کے اپنی رائے پر قائم رہے اور معلومات اور خیالات کا حصول اور ان کی ترسیل کرے جس میں ملکی سرحدیں حائل نہیں ہوں گی۔

20- (1) ہر شخص کو پر امن اجتماع اور تنظیم سازی کی آزادی کا حق ہے۔

(2) کسی شخص کو کسی انجمن میں شامل ہونے کے لیے مجبور نہیں کیا جاسکتا۔

21- (1) ہر شخص کو اپنے ملک کی حکومت میں براہ راست یا بالواسطہ آزادانہ طور پر منتخب نمائندوں کے ذریعے حصہ لینے کا حق ہے۔

(2) ہر شخص کو اپنے ملک میں سرکاری ملازمت حاصل کرنے کا برابر کا حق ہے۔

(3) عوام کی مرضی حکومتی اقتدار کی بنیاد ہوگی۔ یہ رضا با قاعدگی سے منعقد ہونے والے ایسے حقیقی انتخابات کے ذریعے ظاہر کی جائے گی جو عام اور مساوی رائے دہندگی کی بنیاد پر ہوں گے اور خفیہ ووٹ یا اس کے مثال کسی دوسرے آزادانہ طرزِ رائے دہی کے مطابق منعقد ہوں گے۔

22- معاشرے کے رکن کی حیثیت سے ہر شخص کو معاشرتی تحفظ کا حق حاصل ہے اور یہ حق کہ وہ ملک کے نظام اور وسائل کے مطابق ملکی اقدامات نیز میں الاقوامی تعاون سے اقتصادی، معاشرتی اور ثقافتی حقوق حاصل کرے، جو اس کے وقار اور شخصیت کی آزادانہ نشوونما کے لیے ضروری ہے۔

23- (1) ہر انسان کو کام کا ج، روزگار کے آزادانہ انتخاب، کام کا ج کی مناسب و معقول شرائط اور بے روزگاری کے خلاف تحفظ کا حق ہے۔

(2) ہر انسان کو کسی تفریق کے بغیر مساوی کام کے لیے مساوی معاوضے کا حق ہے۔

(3) کام کرنے والا ہر انسان ایسے مناسب و معقول معاوضے کا حق رکھتا ہے جو خود اس کے اور اس کے اہل خانہ کے لیے باعزت زندگی کا ضامن ہو اور جس میں ضرورت پڑنے پر معاشرتی تحفظ کے دوسرے ذرائع سے اضافہ کیا جاسکے۔

(4) ہر شخص کو اپنے مفاد کے تحفظ کے لیے مزدور انجمنیں (ٹریڈ یونین) قائم کرنے اور ان میں شریک ہونے کا حق حاصل ہے۔

24- ہر شخص کو آرام اور تفریح کا حق ہے جس میں اوقات کارکی حد اور تنخواہ کے ساتھ مقررہ تعطیلات کا حق بھی شامل ہے۔

25- (1) ہر شخص کو اپنی اور اپنے اہل و عیال کی صحت اور فلاح و بہبود کے لیے مناسب معیار زندگی کا حق ہے۔ جس میں خواراک، پوشاک، مکان اور علاج کی سہولتیں اور دوسری ضروری معاشرتی سہولیات اور بے روزگاری، بیماری، معدود ری، بیوگی، بڑھاپا اور ان حالات میں روزگار سے محرومی جو اس کے قبضہ قدرت سے باہر ہوں، کے خلاف تحفظ کا حق شامل ہے۔

(2) زچہ اور بچہ خاص توجہ اور امداد کے حق دار ہیں۔ تمام بچے، خواہ وہ شادی کے بغیر پیدا ہوئے ہوں یا شادی کے بعد، معاشرتی تحفظ سے کیساں طور پر فائدہ اٹھائیں گے۔

-26- (1) ہر شخص کو تعلیم کا حق ہے۔ تعلیم کم سے کم ابتدائی اور بنیادی جماعتوں میں مفت ہوگی۔ ابتدائی تعلیم لازمی ہوگی۔ فنی اور پیشہ وارانہ تعلیم حاصل کرنے کا عام انتظام کیا جائے گا اور تمام انسانوں کو اہلیت کی بنیاد پر اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کا مساوی حق دیا جائے گا۔

(2) تعلیم کا مقصد انسانی شخصیت کی پوری نشوونما ہوگی۔ تعلیم کو انسانی حقوق اور بنیادی آزادیوں کے احترام میں اضافے کا ذریعہ بنایا جائے گا۔ تعلیم کے ذریعے تمام قوموں اور نسلی یا مذہبی گروہوں کے درمیان باہمی مفاہمت، رواداری اور دوستی کو فروغ دیا جائے گا۔ نیز تعلیم امن برقرار رکھنے کے لیے اقوام متحده کی کوششوں کو آگے بڑھائے گی۔

(3) اس بات کا فیصلہ کرنے میں والدین کو سب سے زیادہ حق حاصل ہے کہ ان کے پچوں کو کس قسم کی تعلیم دی جائے گی۔

-27- (1) ہر شخص کو قوم کی ثقافتی زندگی میں آزادانہ حصہ لینے، فنون لطیفہ سے فائدہ اٹھانے اور سائنس کی ترقی اور اس کے فوائد میں شرکت کا حق ہے۔

(2) ہر شخص کو حق ہے کہ اس کے ان اخلاقی اور مادی مفادات کا تحفظ کیا جائے جو اسے اپنے سائنسی نظریات یا فنی ایجادات کا موجود ہونے یا ادبی تصنیف کا مصنف ہونے سے حاصل ہوتے ہیں۔

28- ہر انسان ایسے معاشرتی اور بین الاقوامی انتظام کا حقدار ہے جس میں اسے اس اعلامیہ میں درج تمام آزادیاں اور حقوق حاصل ہو سکیں۔

-29- (1) ہر شخص پر معاشرے کے حقوق ہیں کیونکہ معاشرے میں رہ کرہی اس کی شخصیت کی آزادانہ اور مکمل نشوونما ممکن ہے۔

(2) اپنی آزادیوں اور حقوق سے فائدہ اٹھانے میں ہر شخص صرف ایسی حدود کا پابند ہو گا جو دوسروں کی آزادیوں اور حقوق کو تسلیم کرانے اور ان کا احترام کرانے کی غرض سے اور ایک جمہوری نظام میں اخلاق، امن عامہ اور عام فلاح و بہبود کے مناسب تقاضے پورے

کرنے کے لیے قانون کی طرف سے عائد کی گئی ہوں۔

(3) یہ حقوق اور آزادیاں کسی حالت میں بھی اقوام کے مقاصد اور اصولوں کے خلاف عمل میں نہیں لائی جاسکتیں۔

-30- اس اعلان میں شامل کسی دفعہ یا جزو سے کوئی ایسی بات مراد نہیں لی جاسکتی جس سے کسی ملک، گروہ یا شخص کو کسی ایسی سرگرمی میں ملوث ہونے کا، کوئی ایسا کام کرنے کا حق ملتا ہو جس کا مقصد اس اعلامیہ میں درج حقوق اور آزادیوں کی نفی ہو۔

(10 دسمبر 1948ء کو جنرل اسمبلی نے منظور کیا)



22 اپریل 1961 کو میری پیدائش پر میرانام پیٹر جیکب (Peter Jacob) رکھا گیا۔ وجہ یہ تھی کہ خاندان میں میری پیدائش سے پیشتر ایک نوجوان کا انتقال ہو گیا جس کا نام پیٹر تھا۔ یہ نوجوان میری والدہ کا بھتیجا اور میرے ماموں محترم گیر بیل جیکب کا بیٹا تھا۔ ماموں برادری میں تعلیم، فہم، وضع داری، سرکاری و سماجی روشن کے باعث مقبول تھے۔ یوں بہت سے بچوں، بڑوں کے نام جیکب رکھے گئے یا نام میں جیکب کا اضافہ کر لیا گیا۔ ان میں میرے والد، دلدار جیکب بھی شامل تھے۔ (میرے پردادا پرتا ب سنگھ نے سکھوت سے 1890 کے لگ بھگ مسیحیت اختیار کی)۔

گیر بیل جیکب سے میرا ماموں بھانجے کا تعلق تھا تو زمانے کا فرق۔ زمانہ نو آبادیات کے خاتمے اور نئی ریاست کے قیام کا تھا۔ وقت نے انکے حصہ میں باڈنڈری کمشن کے سامنے پاکستان کی سرحدوں کی وکالت لکھی تو میری نسل کے ذمے نئے رشتہوں کی دریافت کا کام تھا۔ لہذا تمام سرحدوں سے پار دیکھنے کی آرزو تھی۔ گذشتہ تین دہائیوں سے یہی کام ہے۔ ملٹان کی خاک ہوں اور 22 سال سے لاہور میں بیسر ہے۔ سفرگلی اور شہر شہر۔

پیٹر کا اردو ترجمہ پھرس ہے۔ پاکستان کی مسیحی برادری میں یہ نام اردو، انگریزی دونوں زبانوں میں مقبول ہے۔ کیونکہ یہ یسوع مسیح (حضرت عیسیٰ) کے جانشین شاگرد شمعون کا یہاں کا لقب تھا جو اسے اُسکے نے عطا کیا۔ یہ ایک زیر (۔) کے فرق کے ساتھ اردو کے مشہور مراج نگار احمد شاہ بخاری کا قلمی نام بھی ہے لیکن اردو کی لغات اس لفظ کے ذکر سے خالی ہیں۔ عبرانی زبان میں پھرس کا مطلب پتھر یا چٹان ہے۔ یہ لفظ اس معنی اور مفہوم میں کئی زبانوں میں صوت کے تھوڑے سے فرق کے ساتھ موجود ہے۔ جیسے پیٹر، پیٹرو، پیٹر اس، پیٹر اس، پیٹر۔ البتہ عربی حروف تھجی میں چونکہ حرف پ، نہیں ہوتا لہذا اسکی شکل بطریقہ بنی (عربی زبان سے اتنی سی واقيعت نے کئی سال پہلے جامعہ الازہر کے دربان اور میرے درمیان ابلاغ کے فاسلے کم کر دیے تھے)۔

لفظ پتھر پاک و ہند کی کئی زبانوں میں استعمال ہوتا ہے۔ پتھر اور پیٹر کے صوت و آہنگ میں فرق کتنا معمولی جبکہ معنے ایک ہیں۔ قابل غور بات یہ ہے کہ زبانیں اور تہذیبیں جن میں صدیوں اور ہزاروں کو سوں کا فاصلہ ہے یہ الفاظ و معانی میں سمٹ کیسے جاتا ہے۔ لگتا ہے کہ انسان نے پتھر کو یہ نام اُس وقت دیا ہو گا جب سے اس نے پتھر کو کار آمد چیزوں میں ڈھالنا اور استعمال کرنا شروع کیا۔ اب بے شک مجھے کوئی پتھر کے زمانے کا انسان کہے، مجھے انسانوں کے درمیان اشتراک اور انسانوں کے مشترکہ ورش کے ناطے مجھے اپنانام پسند ہے جو مجھے اپنے معاشرہ کے علاوہ دنیا کی کئی تہذیبیوں اور زمانوں سے رشتہ قائم رکھنے کی گنجائش فراہم کرتا ہے۔ الفاظ و معنی کے سفر پر نکلیں تو کیا خراکثر ناموں کے سیاق و سبق اتنے ہی وسیع اور انکی داستان اتنی ہی طویل ہو جاتی ہیات انسانی خود۔

